جنوری ۲۰۱۶
شمارہ ۸
المبشر
تعلیمی وتربیتی رسالہ
ایمان کا شجرِ طیبہ
مرضِ جہالت
زندگی کی بے ترتیبی

فہرست

دستک

فہم دین

مضامین

رسائل ومسائل

متفرقات

رابطہ کرنے اور تحریریں بھیجنے کے لیے رابطہ کیجیے almubashir.isp@gmail.com

آفیشل ویب سائٹ
www.islamic-studies.info

رسالے کی ویب سائٹ
www.almubashir.org

لرننگ منیجمنٹ سسٹم
www.islamic-studies.info/lms
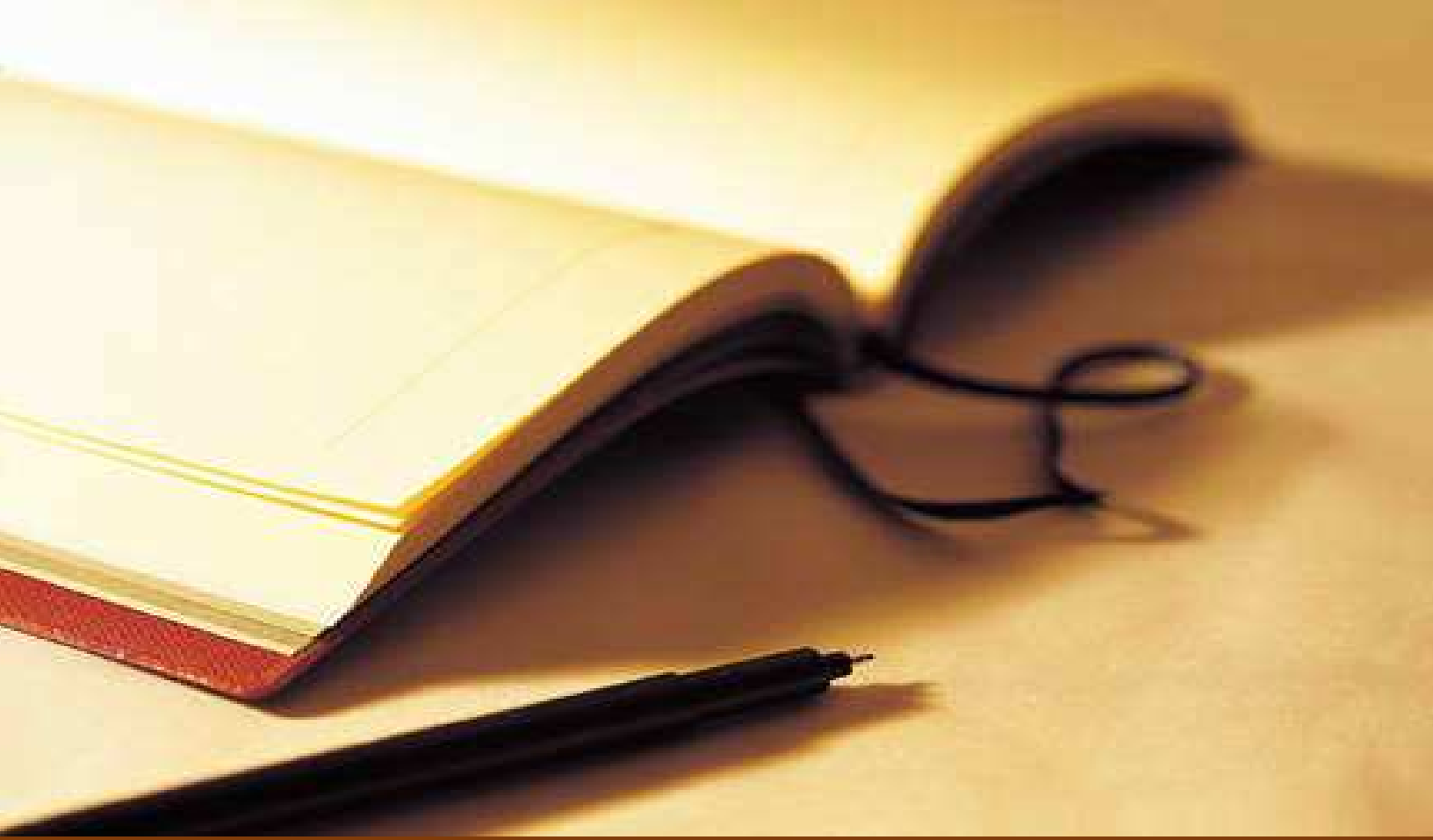
مدیر کے قلم سے

حافظ محمد شارق

گزشتہ روز ہمارے ایک دوست نے ہمیں ایک کتاب تحفے میں دی جس میں برصغیر کے مشہور ماہنامے تہذیب الاخلاق کے مضامین کا انتخاب تھا۔اس کتاب میں میں نواب محسن الملک کا ایک مضمون" موجودہ تعلیم و تربیت کی شبیہ" نظر سے گزرا جس اس مضمون میں انہوں نے مغربی تعلیم اور ہماری مشرقی تعلیم کے متعلق تخیلانہ تجزیہ پیش کیا ہے کہ ایک روز انہوں نے تصور میں دو قسم کے باغ دیکھے، یہ دو باغ دراصل مغربی اور مشرقی تعلیم کی شبیہ تھی۔ان کے سارے مضمون کا خلاصہ آخر میں اس طرح سے ہے۔

"جو باغ ہرا بھرا میں نے مغرب میں دیکھا وہ علوم و فنون جدید کا باغ ہے۔ جس کے پھل پھول ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ پر ہمارا دل بہلانے والا وہاں کوئی نہیں ہے۔ اور جو باغِ خشک میں نے مشرق میں دیکھا۔ وہ ہمارے ہی علوم قدیمہ کا باغ ہے۔ جس کی ویرانی اور خزاں کی کیفیت ہمارے سامنے ہے۔ وہ پتھر جو سرچشمہ پر آگیا ہے۔ جہالت ہے۔ وہ ندی نالے گندے پانی کے رسم و رواج کی پابندی۔ نیکی نما تعصب۔ علم نما نادانی۔ جھوٹا زہد۔ جھوٹی شیخی۔ جاہلانہ تقلید۔ عامیانہ غلامی۔ ضرر انگیز حرارت۔ وحشیانہ تعلیم و تربیت ہے۔ جس کا نتیجہ مسخ انسانیت ہے۔ جو کہ ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور جس کا علاج اب ہم سوائے دعا کے کچھ نہیں پاتے۔"

اس عبارت میں کچھ مبالغہ ضرور ہے کیونکہ مغربی تعلیم کو سراپا رحمت اور پھول بتانا صحیح نہیں ہے لیکن انہوں نے جو تجزیہ ہمارے باغ یعنی میدان علم پر کیا ہے وہ ۹۹٪ درست ہے۔ آج ہمارا طرزِ تعلیم وحشیانہ اور فرسودہ ہو چکا ہے، دینی نظامی کا نصاب ہو یا عصری تعلیم کا۔ دونوں کی ہی حالت انتہائی خراب ہے۔ ہمارا ہر نصاب ہمیں آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے کی طرف دھکیل رہا ہے۔ جو چیز ہمیں اس نصاب سے حاصل کرنی تھی وہ اب سوائے کتابی باتوں کے کہیں دستیاب نہیں ہے۔ ہمارا کلچر اور تہذیب اس وقت مغرب کی مادیت کے شکنجے میں ہے اور فکری اعتبار سے آج مغرب ہی ہم پر مسلط ہے۔ پھر مشاہدے میں آتا ہے کہ کے منفی پہلوؤں کی یلغار کے خلاف جو لوگ اٹھتے ہیں ان میں سے اکثر جذباتی سرگرمیوں میں لگ جاتے ہیں، وہ سارے عالم یا سارے ملک میں ایک ہی دن میں انقلاب لانا چاہتے ہیں، اور جو صحیح راہ پر اس جدوجہد میں مصروف ہے انہیں گمراہ کہا جاتا ہے۔ ہندوؤں اور فرنگیوں سے آزادی حاصل کر لینے کے باوجود ہم فکری لحاظ سے انہی کے غلام ہیں۔ اور ان سب کا نتیجہ کیا ہونا تھا وہ ہمارے سامنے ہی ہے۔ انسانیت کا جنازہ اٹھنے والا ہے اور اخلاق ناپید ہو چکے ہیں۔ ان سب کے علاج کے لیے ہمارے پاس دعا کے علاوہ دعوتی مشن ہے، جو پیغمبروں کا طریقہ ہے، اور اسی امر بالمعروف نہی عن المنکر کے سہارے ہم قوم کے اس مرض کا علاج کر سکتے ہیں۔
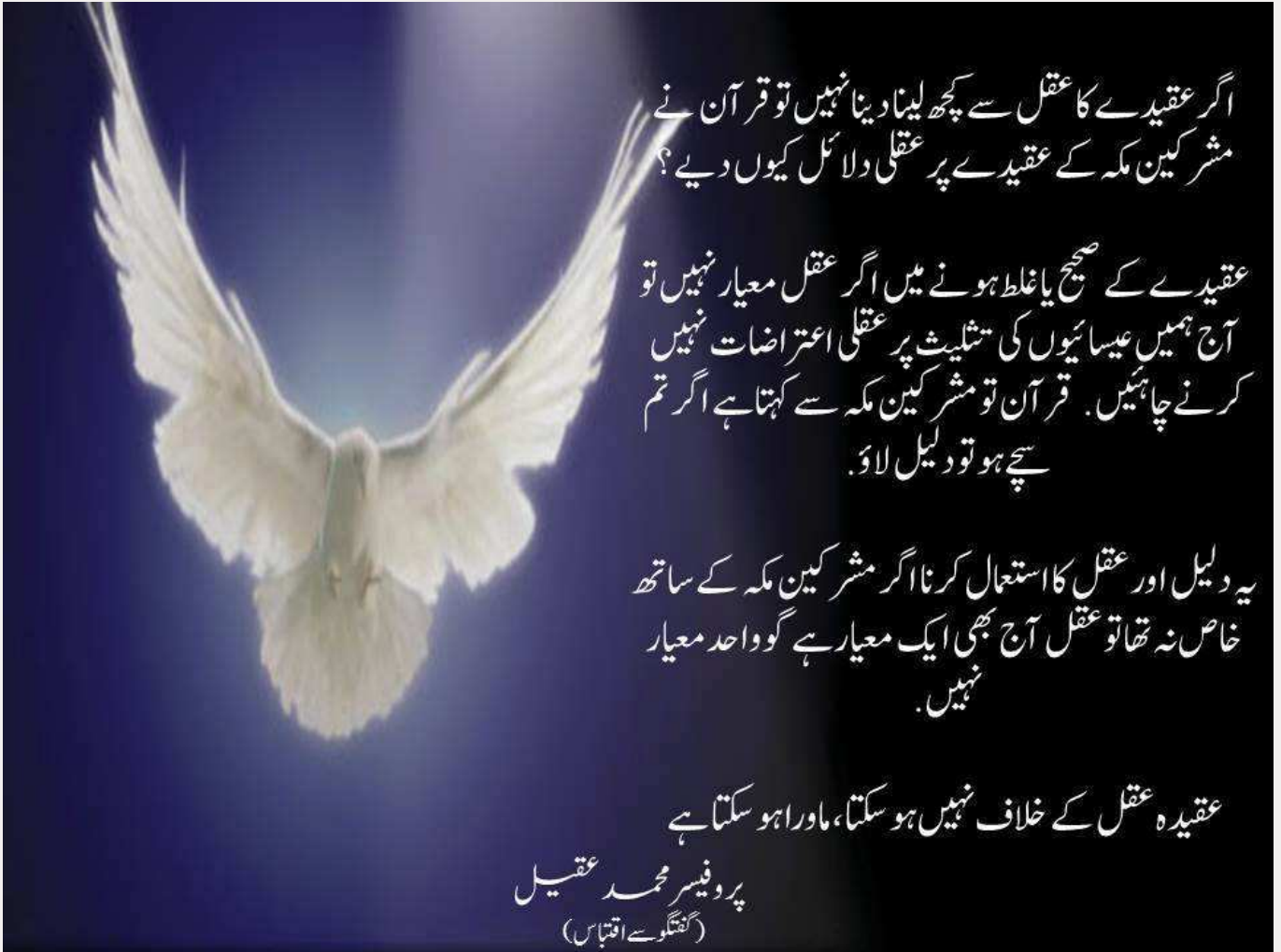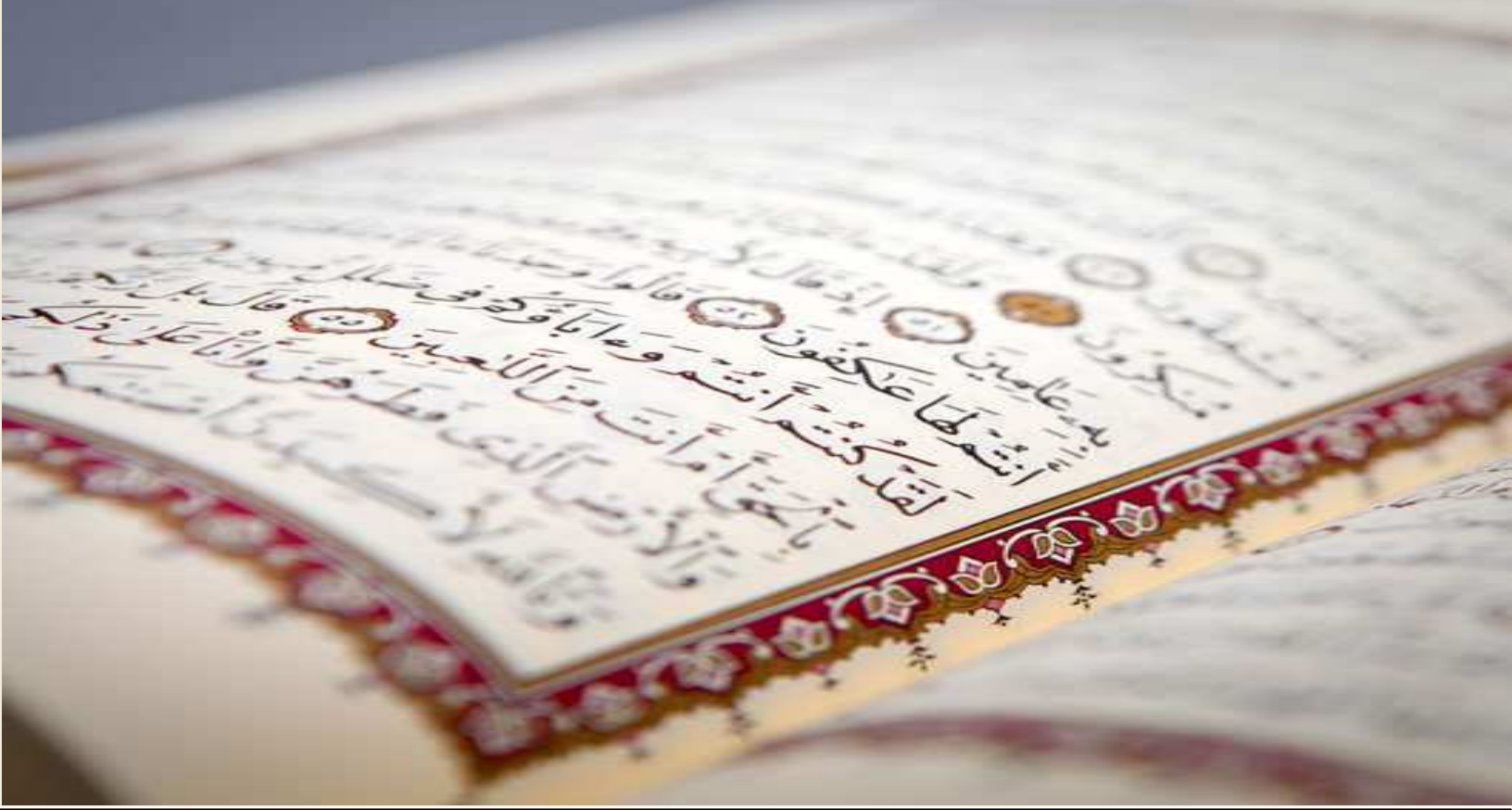
درس قرآن

آیات ۱۰۲تا۱۱۳

پروفیسر محمد عقیل

(نوٹ: طوالت کے پیشِ نظر یہاں عربی عبارت کو شامل نہیں کیا گیا)

ترجمہ: اور ان (ہزلیات) کے پیچھے لگ گئے جو سلیمان کے عہدِ سلطنت میں شیاطین پڑھا کرتے تھے اور سلیمان نے مطلق کفر کی بات نہیں کی، بلکہ شیطان ہی کفر کرتے تھے کہ لوگوں کو جادو سکھاتے تھے۔ اور ان باتوں کے بھی (پیچھے لگ گئے) جو شہر بابل میں دو فرشتوں (یعنی) ہاروت اور ماروت پر اتری تھیں۔ اور وہ دونوں کسی کو کچھ نہیں سکھاتے تھے، جب تک یہ نہ کہہ دیتے کہ ہم تو (ذریعۂ) آزمائش ہیں۔ تم کفر میں نہ پڑو۔ غرض لوگ ان سے (ایسا) جادو سیکھتے، جس سے میاں بیوی میں جدائی ڈال دیں۔ اور خدا کے حکم کے سوا وہ اس (جادو) سے کسی کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے تھے۔ اور کچھ ایسے (منتر) سیکھتے جو ان کو نقصان ہی پہنچاتے اور فائدہ کچھ نہ دیتے۔ اور وہ جانتے تھے کہ جو شخص ایسی چیزوں (یعنی سحر اور منتر وغیرہ) کا خریدار ہو گا، اس کا آخرت میں کچھ حصہ نہیں۔ اور جس چیز کے عوض انہوں نے اپنی جانوں کو بیچ ڈالا، وہ بری تھی۔ کاش وہ (اس بات کو) جانتے (102) اور اگر وہ ایمان لاتے اور پرہیز گاری کرتے تو خدا کے ہاں سے بہت اچھا صلہ ملتا۔ اے کاش، وہ اس سے واقف ہوتے (103) اے اہل ایمان! (گفتگو کے وقت پیغمبرِ خدا سے) راعنا نہ کہا کرو۔ انظرنا کہا کرو۔ اور خوب سن رکھو، اور کافروں کے لیے دکھ دینے والا

عذاب ہے (104) جو لوگ کافر ہیں، اہل کتاب یا مشرک وہ اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ تم پر تمہارے پروردگار کی طرف سے خیر (وبرکت) نازل ہو۔ اور خدا تو جس کو چاہتا ہے، اپنی رحمت کے ساتھ خاص کر لیتا ہے اور خدا بڑے فضل کا مالک ہے (105) ہم جس آیت کو منسوخ کر دیتے یا اسے فراموش کرا دیتے ہیں تو اس سے بہتر یا ویسی ہی اور آیت بھیج دیتے ہیں۔ کیا تم نہیں جانتے کہ خدا ہر بات پر قادر ہے (106) تمہیں معلوم نہیں کہ آسمانوں اور زمین کی بادشاہت خدا ہی کی ہے، اور خدا کے سوا تمہارا کوئی دوست اور مدد گار نہیں (107) کیا تم یہ چاہتے ہو کہ اپنے پیغمبر سے اسی طرح کے سوال کرو، جس طرح کے سوال پہلے موسیٰ سے کئے گئے تھے۔ اور جس شخص نے ایمان (چھوڑ کر اس) کے بدلے کفر لیا، وہ سیدھے رستے سے بھٹک گیا (108) بہت سے اہل کتاب اپنے دل کی جلن سے یہ چاہتے ہیں کہ ایمان لا چکنے کے بعد تم کو پھر کافر بنا دیں۔ حالانکہ ان پر حق ظاہر ہو چکا ہے۔ تو تم معاف کر دو اور درگزر کرو۔ یہاں تک کہ خدا اپنا (دوسرا) حکم بھیجے۔ بے شک خدا ہر بات پر قادر ہے (109) اور نماز ادا کرتے رہو اور زکوٰۃ دیتے رہو۔ اور جو بھلائی اپنے لیے آگے بھیج رکھو گے، اس کو خدا کے ہاں پا لو گے۔ کچھ شک نہیں کہ خدا تمہارے سب کاموں کو دیکھ رہا ہے (110) اور (یہودی اور عیسائی) کہتے ہیں کہ یہودیوں اور عیسائیوں کے سوا کوئی بہشت میں نہیں جانے کا۔ یہ ان لوگوں کے خیالاتِ باطل ہیں۔ (اے پیغمبر ان سے) کہہ دو کہ اگر سچے ہو تو دلیل پیش کرو (111) ہاں جو شخص خدا کے آگے گردن جھکا دے، (یعنی ایمان لے آئے) اور وہ نیکوکار بھی ہو تو اس کا صلہ اس کے پروردگار کے پاس ہے اور ایسے لوگوں کو (قیامت کے دن) نہ کسی طرح کا خوف ہو گا اور نہ وہ غمناک ہوں گے (112) اور یہودی کہتے ہیں کہ عیسائی رستے پر نہیں اور عیسائی کہتے ہیں کہ یہودی رستے پر نہیں۔ حالانکہ وہ کتاب (الہٰی) پڑھتے ہیں۔ اسی طرح بالکل انہی کی سی بات وہ لوگ کہتے ہیں جو (کچھ) نہیں جانتے (یعنی مشرک) تو جس بات میں یہ لوگ اختلاف کر رہے خدا قیامت کے دن اس کا ان میں فیصلہ کر دے گا (113)

قرآن فہمی میں آج ایک اہم اصول سے ابتدا کرتے ہیں۔ جس طرح ہم اردو یا انگلش میں لکھتے ہیں اور موضوع تبدیل ہونے پر یا اس میں کوئی موڑ آنے پر ہم پیراگراف بدل دیتے ہیں۔ یہی معاملہ قرآن میں بھی ہوتا ہے۔ لیکن عربی میں لکھا ہونے کی بنا پر تمام سطور ایک ساتھ لکھ دی جاتی ہیں اور سلسلہ کلام میں فرق کو ایک دوسرے سے الگ کرنا پڑھنے والے کے لیے مشکل معلوم ہوتا ہے۔ اوپر آیات کا مطالعہ کریں تو یہ علم ہو گا کہ اس میں دو یا تین چھوٹے چھوٹے موضوعات بن سکتے ہیں۔

ایک پیراگراف تو ہاروت ماروت والے واقعے کا ہے جو آیت نمبر ۱۰۲ میں شروع ہوتا اور آیت ۱۰۳ پر ختم ہو جاتا ہے۔ دوسرا موضوع مسلمانوں کو یہود کی سازش کا توڑ بتا کر انداز تخاطب درست کرنے کا ہے۔ اس کے علاوہ بھی دیگر موضوعات ہیں۔

ان تمام آیات کا سیاق دیکھیں تو وہی سلسلہ کلام ہے یعنی بنی اسماعیل کو ان کے جرائم کی فہرست بتائی جا رہی ہے تا کہ ان کی امت وسط کے عہدے سے معزول کیا جا سکے۔

آیت ۱۰۲ میں اللہ تعالیٰ نے یہود کے دعووں کی تردید کی ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام جادو یا کفر میں ملوث نہیں تھے بلکہ یہ

شیاطین تھے جو لوگوں کو جادو سکھاتے اور کفر کی جانب راغب کرتے تھے۔ ہاروت وماروت دو فرشتوں پر اللہ نے روحانی علم اتارا تھا جو اپنی ذات میں ممنوع نہ تھا۔ لیکن اس علم سے دنیاوی علم کی طرح اچھے اور برے دونوں طرح کے کام لیے جاسکتے تھے۔

نفسی علوم دو وجوہات کی بنا پر ناجائز ہوتے ہیں۔ ایک تو ان کے حصول کا طریقہ اور دوسرا ان کے استعمال کا طریقہ۔ اگر کوئی نفسی علم شیطانی قوتوں سے مدد لے کر حاصل کیا جائے تو ناجائز ہے۔ ماہرین کے مطابق جنات میں موجود شیاطین انسان کو مدد فراہم کرتے ہیں اور اس کے بدلے میں وہ انسان سے شرک کرواتے، اپنی پوجا کرواتے، اپنے کسی دیوی یا دیوتا کی پوجا کراتے، کسی انسان کو قتل کراتے یا کسی اور گناہ کبیرہ کا ارتکاب کراتے ہیں۔ چونکہ اس علم کا حصول شرک وکفر پر مبنی ہے اسی لئے اس علم کو حرام قرار دیا گیا ہے۔

نفسی علوم کی دوسری قسم اپنی ذات میں جائز ہے انہیں ہم جائز نفسی علوم یا پیرا سائکو لوجی کہہ سکتے ہیں۔ ان کے جائز ہونے کی وجہ ان کے حصول کا طریقہ ہے۔ ان کے حصول میں کسی شیطانی قوت یا شرک کی آمیزش نہیں ہوتی۔ یا تو اس علم کو جائز مذہبی روایات سے اخذ کیا جاتا ہے یا پھر نیوٹرل طریقہ لیا جاتا ہے جس پر کوئی شرعی یا اخلاقی قدغن نہیں۔ البتہ یہ علم اس وقت ناجائز ہو جاتا ہے جب اس سے غلط قسم کے مقاصد حاصل کیے جائیں جیسے کسی کو قتل کرا دینا، کسی کو ایذا پہنچانا وغیرہ۔

سوال یہ ہے کہ ہاروت ماروت پر جو علم اتارا گیا تھا کیا وہ جادو اور شرک پر مبنی تھا۔ ظاہر ہے اللہ تعالی اپنے فرشتوں کے ذریعے اس قسم کا کوئی علم کیسے اتار سکتے ہیں جس میں شرک کی آلائش ہو۔ میری رائے کے تحت ہاروت وماروت پر اتارا گیا علم پیرا سائکلوجی کے جائز علوم میں سے ایک تھا۔ البتہ اس کا استعمال منفی و مثبت دونوں طریقوں سے کیا جاسکتا تھا۔ جیسا کہ اسی آیت میں ہے:

> غرض لوگ ان سے (ایسا) سحر سیکھتے، جس سے میاں بیوی میں جدائی ڈال دیں۔ اور خدا کے حکم کے سوا وہ اس (سحر) سے کسی کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے تھے۔ اور کچھ ایسے سیکھتے جو ان کو نقصان ہی پہنچاتے اور فائدہ کچھ نہ دیتے۔ (البقرہ ۲:۱۰۲)

اس آیت میں ہے کہ اس علم سے فائدہ بھی پہنچ سکتا تھا اور نقصان بھی۔ لیکن انھوں نے صرف نقصان پہنچایا جس میں سر فہرست میاں بیوی میں جدائی تھی۔ اس کی وجہ بھی کچھ علما کے نزدیک یہ تھی کہ بنی اسرائیل کو اس دور میں غیر یہودی عورت سے شادی کرنا ممنوع تھا۔ اس وقت خواتین کی کمی تھی اس لئے لوگ جدائی ڈلوا کر اس کی عورت کو اپنی بیوی بنانا چاہتے تھے۔ تو بہر حال وہ علم

کسی طور شرکیہ یا ممنوع علم نہ تھا بلکہ اپنی اصل میں جائز تھا۔ اس کے منفی استعمال کی مذمت کی گئی ہے۔ یعنی وہ علم اپنی ذات میں حرام نہیں بلکہ آزمائش تھا۔ البتہ اس کا منفی استعمال اسے حرام بنا رہا تھا۔

اس کے بعد اگلی آیات میں مسلمانوں کو یہود کے برخلاف وہ الفاظ استعمال کرنے کی تلقین کی ہے جو ذو معنی نہ ہوں۔ یہود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرتے وقت راعنا (توجہ فرمایئے) کی بجائے راعینا (اے ہمارے چرواہے) کہتے تھے۔ تو مسلمانوں کو یہاں منع کر دیا کہ آپ انظرنا کہو تاکہ اس سازش کا قلع قمع ہو جائے۔ یہی سبق ہمارے لیے بھی ہے کہ ہمیں طنز کے طور پر ذو معنی جملے ادا نہیں کرنے چاہئیں۔

اگلی آیات میں یہود و نصاری کے اس زعم کی تردید ہے کہ صرف وہی جنت میں جائیں گے۔ اللہ نے واضح طور فرمادیا کہ جنت میں صرف وہی جائے گا جو خدا کے آگے سر تسلیم خم کر دے۔ اس کا تعلق نہ تو یہود ہونے سے ہے اور نہ عیسائی۔ یہ بات مسلمانوں پر بھی منطبق ہوتی ہے۔ اگر کوئی مسلمان گھرانے میں پیدا ہو گیا اور اس نے خدا کے آگے سر تسلیم خم نہ کیا تو وہ محض مسلمان گھرانے میں پیدا ہونے کی بنا پر بچ نہیں جائے گا۔ یہ عین ممکن ہے کہ اللہ اس کا زبانی اقرار رد کر کے اس کے دل کی کیفیت کے مطابق اس کا فیصلہ کر دیں۔

قول ایک سواری ہے، جو آپ کو عمل کے کنارے پر لے جاتی ہے۔ خرابی یہ ہوتی ہے کہ ہم قول کی سواری کو اختیار کرتے ہیں، اس کشتی میں بیٹھتے ہیں، چپوؤ چلاتے ہیں، عمل کے کنارے پر پہنچتے ہیں، لیکن اس کشتی کو چھوڑتے نہیں ہیں اس کے اندر رہتے ہیں، وہ وہیں چکر کاٹتی رہتی ہے۔ عمل کا کنارہ سامنے رہتا ہے اور ہم اس کی طرف جا نہیں رہے ہوتے۔

انتخاب: اُم عبداللہ (اسلام آباد)

فہم حدیث

ایمان کا شجرِ طیبہ

حافظ محمد شارقؔ

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

الْإِيمَانُ بِضْعٌ وَسَبْعُونَ أَوْ بِضْعٌ وَسِتُّونَ شُعْبَةً فَأَفْضَلُهَا قَوْلُ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَأَدْنَاهَا إِمَاطَةُ الْأَذَى عَنْ الطَّرِيقِ وَالْحَيَاءُ شُعْبَةٌ مِنْ الْإِيمَانِ

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایمان کی ستر سے کچھ زیادہ شاخیں ہیں۔ جن میں سب سے افضل لا الٰہ الا اللہ (یعنی توحید) کا اقرار کرنا ہے اور ان میں سب سے ادنیٰ درجہ راستے سے کسی تکلیف دہ شے کو دور کر دینا ہے، اور حیاء بھی ایمان کی ایک اہم شاخ ہے۔'' (صحیح مسلم، الصحیح، کتاب الایمان)

ایمان کے معنیٰ زبان اور قلب سے کسی امر کی تصدیق کرنا اور اسے قبول کرنا ہے۔ شارحینِ حدیث کے مطابق یہاں ستر کے عدد کے ذکر سے کسی خاص تعداد کا تعین مقصود نہیں بلکہ اہل عرب کے ہاں یہ اسلوب محاورۃً ''کئی'' یا کثرت کے معنوں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ یعنی اس حدیث

میں ایمان کی ستر شاخوں سے مراد یہ ہے ایمان کے بہت سے شعبے ہیں۔ ایمان کے شعبوں سے متعلق مشہور محدث امام بیہقی کی تصنیف "شعب الایمان" ہے جس میں توحید اور راستے سے اذیت دہ شے ہٹانے کے درمیان جس قدر بھی نیک کاموں کا تصور کیا جاسکتا ہے، وہ سب اس میں شامل ہیں، خواہ ان کا تعلق حقوق اللہ سے ہو یا حقوق العباد سے۔

یہاں اس حدیث کے تناظر میں ایمان کی مثال ایک درخت سے بیان کی جاسکتی ہے۔ ایک درخت کی جڑ زمین کے اندر راسخ ہوتی ہے اس جڑ سے مزید ڈالیاں اور شاخیں نکلتی ہے جو نہ صرف اس کی خوب صورتی کا ضامن ہوتی ہیں بلکہ اس درخت کی اصل حقیقت کا خوشنما مظہر بھی ہوتی ہے۔ اگر اس درخت کی بعض شاخیں نکل جائیں تو اصل درخت کا وجود تو باقی رہتا ہے مگر اس میں نقص آجاتا ہے۔ بعینہ یہی کیفیت بندہ مومن کے ایمان کی ہے۔ اگر اس کی شاخوں میں سے بعض شاخیں ٹوٹ جائیں تو ایمان گو کہ باقی رہتا ہے مگر اس درخت کا وجود بے ثمر ہوتا ہے۔ ایمان کی یہ شاخیں دراصل انسان کے اعمال واخلاق اور ظاہری و باطنی احوال پر مشتمل ہوتی ہیں۔ اگر کوئی شخص ایمان کا دعوے دار ہے لیکن اس کے کردار سے ایمان کی شاخیں نہیں پھوٹتی تو اس کا یہ دعویٰ باطل ہے۔ زیر نظر حدیث میں ایمان کے حوالے سے تین چیزیں بیان ہوئی ہیں: اول یہ کہ اللہ کے سوا کسی کو الٰہ نہ مانا جائے۔ دوم ضرر رساں چیزوں کو راستے سے ہٹانا اور سوم یہ کہ حجاب وحیاء بھی ایمان کی ایک شاخ ہے۔

حدیث کے مطابق ایمان کا سب سے اعلیٰ شعبہ لا الہ الا اللہ یعنی خدا تعالیٰ کی وحدانیت کا اقرار کرنا اور اس ذات کے علاوہ کسی کو الٰہ نہ ماننا ہے۔ الٰہ کے مفہوم اس بات سے کی گنجائش نہیں رکھتا کہ اسے محض ظاہری پرستش کی ہستی تک محدود کیا جائے۔ بلکہ الٰہ سے مراد ہر وہ شے، ہستی، یا تصور ہے جسے انسان اپنی زندگی کا نصب العین اور اپنے تمام اعمال و نظریات کا محور بنالے۔ الٰہ کا یہی تصور قرآن مجید میں سورۃ الفرقان میں اس طرح بیان کیا گیا ہے۔ ﴿أَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَٰهَهُ هَوَاهُ وَأَضَلَّهُ اللَّهُ عَلَىٰ عِلْمٍ وَخَتَمَ عَلَىٰ سَمْعِهِ وَقَلْبِهِ وَجَعَلَ عَلَىٰ بَصَرِهِ غِشَاوَةً فَمَن يَهْدِيهِ مِن بَعْدِ اللَّهِ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ﴾ اس شخص کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے جس نے اپنی خواہش نفس کو الٰہ بنالیا ہے؟ کیا آپ اس کی ذمہ داری لے سکتے ہیں؟ (الفرقان 43)

وحدانیت کے بعد ایمان کی سب سے ادنیٰ شاخ کا ذکر ہے جو راستے سے تکلیف دہ شے ہٹانا ہے۔ راستے میں کوئی بھی ایسی شے جو راہ گیر کو تکلیف پہنچا سکتی ہو، اسے خدمت خلق کے جذبے کے تحت ہٹا دیا جائے اور راستہ صاف کر دیا جائے۔ شہری معاشرے میں ٹریفک جام بھی راہ گیروں کی تکلیف کا باعث بنتا ہے، چنانچہ ایسے موقع پر ٹریفک قوانین سے آشنا لوگوں کا فرض بنتا ہے کہ وہ رضاکارانہ طور پر ٹریفک کنٹرول کریں۔ اسی طرح راستہ صاف کرنے کے علاوہ ہم خود بھی ایسا کوئی کام یا کوئی رکاوٹ کھڑی نہ کریں جو مسافروں کے لیے تکلیف کا باعث ہو۔

حدیث کے آخری حصے میں حیاء کو ایمان کی ایک اہم شاخ قرار دیا گیا ہے۔ واضح رہے کہ شرم اور حیا میں فرق ہے۔ اصطلاحاً حیا اس کیفیت کو کو کہا جاتا ہے جو انسان کو کوئی معیوب اور غیر اخلاقی کام کرنے سے روکتی ہے۔ جبکہ شرم سے مراد وہ جھجک ہے جو اکثر اوقات ہم جائز امور میں بھی محسوس

کر لیتے ہیں۔

حیا کی صفت کی بدولت انسان معاشرے میں پاکیزہ اور محترم زندگی گزارنے کی کوشش کرتا ہے۔ بالفرض وہ کوئی ایسا فعل کر بیٹھتا ہے تو اس کا ضمیر اس پر مطمئن نہیں ہو پاتا جس کی وجہ سے خدا کے حضور رجوع کا موقع موجود رہتا ہے۔ ہم اپنے اندر حیاء پیدا کر لیں تو ہر قسم کی برائی سے بچ سکتے ہیں۔ لیکن ہم حیا ہی نہ کریں تو حدیث کے مطابق شتر بے مہار کی طرح جو چاہیں کر سکتے ہیں ہمیں کبھی خدا کے حضور کسی ندامت کا احساس نہیں ہو گا مگر آخرت میں اس کی دردناک سزا ضرور ملے گی۔

شرم و حیا کی حفاظت کے لیے ضروری ہے کہ ہم صحبت صالحین اختیار کریں اور اس بات کو اپنی زندگی کا مقصد بنالیں کہ ہمیں قرآن و سنت کی تعلیمات کے مطابق اپنی شخصیت کی تعمیر کرنی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اس حدیث پر عمل کرنے اور اسے دوسروں تک پہنچانے کی ہمت و توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

انسان جتنی محنت خامی چھپانے میں صَرف کرتا ہے،

اتنی محنت میں خامی دور کر سکتا ہے۔

واصف علی واصف

دلالتِ نص (اشارۃً نص۔۔۔حصہ دوم)

حافظ محمد شارق

اقتضاءالنص سے مراد یہ ہے کہ کلام یا نص میں شرعی الفاظ کے علاوہ کسی خارجی لفظ کو محذوف ماننا کہ جس پر کلام یا نص کی درستگی موقوف ہو۔یعنی کلام میں کسی ایسے لفظ کو مقدر مان لیا جائے جس سے وہ کلام درست بن جاتا ہو، چوں کہ کلام یا نص کی صحت اس معنی کا تقاضا کرتی ہے اس لیے اقتضاءالنص کہلاتا ہے۔علامہ سرخسی اقتضاءالنص کی اصطلاحی تعریف یوں کرتے ہیں:

زیادة علی المنصوص علیه یشرط تقدیمه لیصیر المنظوم مفید أو موجباً للحکم وبدونه لایمکن

" منصوص علیہ پر ایسی زیادتی جس کی تقدیم شرط ہو، تاکہ منظوم مفید حکم یا موجب حکم ہو سکے۔اس کے بغیر منظوم کو عامل بنانا ممکن نہ ہو۔"

(امام السرخسی، اصول السرخسی، ج1، ص248)

یعنی کلام کی عقلی یا شرعی صداقت یا کلام کو عامل بنانے کے لیے "نص کی دلالت" نہ اس کے اپنے کسی صیغے، نہ الفاظ اور نہ ہی معنی کی وجہ سے ہو بلکہ وہ دلالت ایسے زائد لفظ یا امر کی وجہ سے ہو جس کو مقدر "محذوف" ماننا ضروری ہو۔ جیسے ارشادِ ربّانی ہے:

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهَاتُكُمْ وَبَنَاتُكُمْ (النساء:23)

اس آیت کے لفظی معنی یہ ہے کہ "حرام کی گئی ہے تم پر تمھاری مائیں اور بیٹیاں" یہاں پر اس کلام کی درستگی کے لیے اقتضاء النص کے طریقے کے مطابق لفظ "نکاح" کو مقدر یعنی پوشیدہ، محذوف مانا گیا ہے۔ کیوں کہ حرمت کا تعلق ذات سے نہیں بلکہ اصلاً اس فعل سے ہے جس کا تعلق ذات سے ہے اور وہ فعل "نکاح" ہے۔ لہذا اس آیت کا مطلب یہ ہو گا کہ "تم پر اپنی ماؤں اور بیٹیوں سے نکاح کرنا حرام ہے۔"

جیسے کوئی شخص اپنے مخاطب سے یوں کہے کہ: أَعْتِقْ عَبْدَکَ عَنِّیْ بِأَلْفٍ "تم اپنا غلام میری طرف سے ایک ہزار میں آزاد کر دو۔"

یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ "متکلم" مخاطب کو کسی ایسے کام کا کہہ رہا ہو جس پر "متکلم" کا اختیار ہی نہ ہو، متکلم اس کا مالک ہی نہ ہو۔ اور غلام کی آزادی اپنے مالک کی طرف سے ہی ہو سکتی ہے لہذا یہاں پر پر اس کلام کی درستگی کے لیے اقتضاء النص کے طریقے کے مطابق لفظ "نکاح" کو مقدر یعنی پوشیدہ، محذوف مانا گیا ہے۔ کیوں کہ حرمت کا تعلق ذات سے نہیں بلکہ اصلاً اس فعل سے ہے جس کا تعلق ذات سے ہے اور وہ فعل "نکاح " ہے۔ لہذا اس آیت کا مطلب یہ ہو گا کہ " تم پر اپنی ماؤں اور بیٹیوں سے نکاح کرنا حرام ہے۔" جیسے کوئی شخص اپنے مخاطب سے یوں کہے کہ:

أَعْتِقْ عَبْدَکَ عَنِّیْ بِأَلْفٍ "تم اپنا غلام میری طرف سے ایک ہزار میں آزاد کر دو۔"

یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ "متکلم" مخاطب کو کسی ایسے کام کا کہہ رہا ہو جس پر "متکلم" کا اختیار ہی نہ ہو، متکلم اس کا مالک ہی نہ ہو۔ اور غلام کی آزادی اپنے مالک کی طرف سے ہی ہو سکتی ہے لہذا یہاں پر غلام کی آزادی کے لیے "متکلم" کو غلام کا مالک بننا ضروری ہے۔ اس لیے "متکلم" کے کلام کی درستگی کے لیے ان الفاظ کو مقدر ماننا ضروری ہے اور عبارت یوں ہوں گی کہ: "ملکنی عبدک بالف ثم اعتقہ" یعنی " مجھے ایک ہزار میں تم اپنے غلام کا مالک بنا کر میری طرف سے اس کو آزاد کر دو۔" لہذا اس مثال میں بھی "اقتضاء النص کے طور پر خریدنا ثابت ہو رہا ہے۔ ارشاد نبوی ﷺ ہے کہ:

إِنَّ اللَّهَ قَدْ تَجَاوَزَ عَنْ أُمَّتِي الْخَطَأَ ، وَالنِّسْيَانَ ، وَمَا اسْتُكْرِهُوا عَلَيْهِ. (ابن ماجہ، سنن ابن ماجہ، رقم:2043)

"بے شک اللہ تعالیٰ نے میری امت سے خطاء اور نسیان اور وہ گناہ جو جبراً کروایے گیے ہو اٹھا دیے گیے ہیں۔" دیکھا جائے تو ظاہر نص، کلام سے یہی واضح ہو رہا ہے کہ جو فعل غلطی سے، بھول کر یا جبراً کیا گیا ہو تو وہ فعل امت سے اٹھا لیا گیا ہے۔ جو کہ درست نہیں ہے کیوں کہ ان افعال کا صدور عملی طور پر امت میں ہو رہا ہے۔ لہذا یہاں بھی کلام کی درستگی کے لیے کچھ الفاظ کو مقدر مانا جائے گا۔ اور عبارت یوں ہو گی کہ: "میری امت سے خطا، نسیان اور جبراً کروایا گیا گناہ معاف کر دیا ہے، ان افعال کا حکم اٹھا لیا گیا ہے۔

مسجد نبوی ﷺ کا قیام اور تاریخی کردار

حصہ دوئم

شبانہ نورین (پشاور)

اصلاح معاشرہ میں مسجد نبوی ﷺ کا کردار:

مرکز اسلام کی یہ مسجد صرف رسمی مسجد نہ تھی بلکہ اسلام کا ناقابل تسخیر قلعہ تھی جہاں دین و دنیا کے سارے قوانین ترتیب پاتے تھے۔ لشکر اسلام کے قواعد جنگ بتائے جاتے تھے، یہیں سے جہاد کے لیے فوج روانہ کی جاتی تھی۔ وفود یہیں اترتے تھے، اسی میں مدینہ کا پہلا اسلامی دارالعلوم تھا، اسی میں نبی کریم ﷺ کا دربار لگتا تھا، اسی میں فصل خصومات سنائے جاتے تھے اور اسی میں مجرمین کو قید کیا جاتا تھا۔ گویا دار الشریعت (پارلیمنٹ) دارالعلوم (یونیورسٹی) دار لعسکر (فوجی چھاونی) دارالحبس (جیل خانہ) سب کا کام اسی مسجد مقدسہ سے لیا جاتا تھا اور اسی میں وہ متبرک حصہ بھی ہے جس کو حدیث میں " روضۃ من ریاض الجنۃ" فرمایا گیا ہے۔(۱۵) جس کی تشریح میں مختلف باتیں کہی گئی ہیں۔ مگر محققین نے اسے اس کے ظاہر پر محمول کیا ہے۔ کہ زمین کا یہ حصّہ واقعی جنت سے لایا گیا ہے۔ اسی طرح یہ حصّہ رحمت عالم ﷺ کے لیے اتارا جانا ممکن ہے۔ جس کو ہماری آنکھیں اپنی طبعی ظلمت کی وجہ سے تمیز کرنے سے قاصر ہے۔(۱۶)

مجلس شوریٰ ومرکز درس وتبلیغ:

مسجد نبوی ﷺ کو پارلیمنٹ کی حیثیت حاصل تھی اور تمام مسلمان اس کے رکن تھے۔ ہر فرد کو آزادی رائے کا حق حاصل تھا۔ اس پارلیمنٹ میں مجلس شوریٰ اور مجلس انتظامیہ کے اجلاس بھی ہوا کرتے تھے۔(۱۷)اس طرح مسجد نبوی ﷺ میں اصحاب صفّہ کے اہل تر اشخاص کو تبلیغ دین کے لیے بھیجا جاتا تھا۔ جب کوئی وفد خدمت اقدس ﷺ میں حاضر ہوتا اور دین سکھلانے کے لیے کسی معلم کا مطالبہ کرتا تو آپ ﷺ کی نظر انتخاب اکثر اصحاب صفّہ پر پڑتی تھی۔(۱۸)

صفّہ کا چبوترا:

مسجد کے ایک سرے پر اصحاب صفّہ کے لیے ایک مسقف چبوترہ بھی تعمیر کیا گیا تھا۔ یہ وہ مقدس لوگ تھے جن کا گھر بار نہ تھا اور جو عائلی زندگی کی بندشوں سے آزاد تھے۔ ان کی تعداد پانچ سو تک تھی اور ان کا کام سیکھنا اور سکھانا تھا۔(۱۹) شب وروز تحصیل علم میں مصروف رہتے اور اپنا وقت انتہائی سادگی سے گزارتے، زہد وعبادت ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ یہی وہ لوگ تھے جو مبلغ کی حیثیت سے دوسرے علاقوں میں بھیجے جاتے تھے۔ اور آپ ﷺ یہ ہدایت فرماتے:

ان یقرءھم القرآن ویعلمھم الاسلام ویفقھم فی الدین(۲۰)

”وہ انھیں قرآن پڑھائیں۔ اسلام کی تعلیم دیں اور ان میں دین کی سمجھ پیدا کریں۔“

یونیورسٹی اور دربار عدالت:

یہ ایک یونیورسٹی تھی جہاں پر مسلمان اسلامی تعلیمات و ہدایات کا درس حاصل کرتے تھے۔ اسی طرح دور نبوی ﷺ میں مسجد نبوی ﷺ عدالت بھی تھی۔ لوگ اپنے تنازعات اور مقدمات اسی جگہ نبی کریم ﷺ کے سامنے پیش کرتے اور آپ ﷺ ان کے فیصلے کیا کرتے تھے۔ اس مسجد نے سپریم کورٹ کا کردار ادا کیا۔ تمام رفاہی امور بھی اسی مسجد میں سر انجام پاتے تھے۔ تجارت کے لیے بھی یہ ایک کامرس چیمبر کی حیثیت رکھتی تھی۔ زراعت کے لیے اسے ایگریکلچر ہاؤس قرار دیا گیا تھا۔ سینکڑوں کی تعداد میں مہاجرین مدینہ کی چھوٹی سی بستی میں وارد ہوئے ان کو اس معاشرے میں مواخات اور مساوات کا درس اسی مسجد کی صحن میں بیٹھا کر دیا گیا۔(۲۱)

سرکاری خزانہ:

مسجد نبوی ﷺ میں ایک بالاخانہ بنایا گیا تھا جو کہ سرکاری خزانہ (بیت المال) کا کام دیتا تھا۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ اس کے نگران تھے۔ مال غنیمت، صدقات و خیرات اور دیگر تمام سرکاری چیزیں وہاں رکھی جاتیں اور نبی کریم ﷺ کے ارشاد کے مطابق انہیں خرچ کیا جاتا تھا۔ (۲۲)

مسجد نبوی ﷺ میں توسیع کے مراحل:

۷ ہجری کو نبی کریم ﷺ جب غزوہ خیبر سے کامیاب لوٹے تو آپ ﷺ نے مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیش نظر مسجد کی تجدید اور توسیع پر خاص توجہ دی۔ مسجد کے قریب ایک انصاری کا مکان خرید کر مسجد میں شامل کر دیا۔ اس توسیع اور تعمیر کے بعد مسجد کا رقبہ ۲،۴۷۵ ہو گیا۔ (۲۳)

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا دور:

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اپنے دور خلافت میں فتنہ ارتداد کے خاتمہ میں مصروف تھے۔ جس کی وجہ سے ان کو مسجد نبوی میں اضافہ کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ البتہ کھجور کے تنوں سے بنائے ہوئے دور نبوی کے ستون کھوکھلے ہو گئے تو آپ رضی اللہ عنہ نے ان کو بدل دیا۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا دور:

حضرت عمر فاروق کے دورِ خلافت میں مسلمانوں کی تعداد بڑھ گئی تو آپ رضی اللہ عنہ نے ۱۷ ہجری میں مسجد نبوی ﷺ کی توسیع و تعمیر کا کام شروع کروایا اور انسانی قد تک بنیادیں پتھر سے بنائیں۔ نیز حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مسجد کے قرب و جوار کے مکانات خرید کر ان کا احاطہ بھی مسجد میں شامل کر دیا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے مسجد کے دروازوں میں بھی اضافہ کیا اور چھ دروازے بنوائے۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا دور:

آپ رضی اللہ عنہ نے ۲۹ ہجری میں مسجد نبوی ﷺ کی توسیع اور تعمیر نو کی اور اس میں قبلہ کے آگے جنوبی حصے میں اضافہ کیا۔ قبلہ کی طرف ایک بر آمدے کا اضافہ بھی فرمایا اور قبلہ کی دیوار اس جگہ بنائی جہاں وہ آج ہے۔ انھوں نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ اور جعفر طیار رضی اللہ عنہ کا مکان خرید کر انھیں مسجد کی حدود میں شامل کیا۔ یہ تعمیر یکم محرم ۳۰ھ کو پایہ تکمیل کو پہنچی۔ آپ رضی اللہ عنہ کی یہ تعمیر منقوش پتھروں سے بنائی گئی تھی اور چھت ساگوان کی خوشبودار لکڑی سے ڈالی گئی البتہ مقصورہ اینٹوں ہی سے بنایا گیا۔ (۲۴)

پانچویں مرتبہ مسجد نبوی ﷺ کی تعمیر وتوسیع ولید بن عبد الملک کے زمانے میں ہوئی۔اس وقت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ عنہ مدینہ کے گورنر تھے۔انھوں نے ازواج مطھرات کے حجرے اور قرب وجوار کے کئی دوسرے مکانات کی جگہ خرید کر مسجد کے احاطے میں اضافہ کیا۔اس طرح عمر بن عبد العزیز اور خلیفہ مہدی نے اپنے اپنے دور خلافت میں مسجد نبوی کی توسیع کی۔(۲۵)سعودی خاندان کی حکومت میں اب تک مسجد کی حدود میں کافی توسیع کی گئی ہے۔شاہ عبد العزیز بن سعود نے ۱۴ رمضان المبارک ۱۳۷۲ھ میں توسیع کے کام کا آغاز کروادیا تھا جو شاہ فیصل کے زمانے میں بھی ہوتا رہا۔(۲٦)

حوالہ جات:

۱۱:القرآن،۹: ۱۰۸

۱۲:امام مسلم،ابوالحسین مسلم بن الحجاج بن مسلم القشیری النیساپوری، صحیح مسلم، دارالجیل بیروت، طبع نامعلوم، ج۴،ص ۱۰۲،رقم ۳۳۲۵

۱۳:امام بخاری،ابوعبداللہ، محمد بن اسماعیل بن ابراہیم بن المغیرہ، صحیح بخاری، دار الشعب القاھرہ، طبع۱۴۰۷ـ۱۹۸۷،ج ۲،ص ۷۷،رقم ۱۱۹٦

۱۴:ایضاً،ج ۲،ص ٦۷

۱۵:ظفیر الدین، اسلام کا نظام مساجد، دارالاشاعت مقابل مولوی مسافر خانہ، کراچی، ص ۲۳،۲۲

۱٦:طالب الہاشمی، سیرت میزبان رسول ﷺ ابوایوب انصاری، ص ۱۰۷

۱۷:صفی الرحمٰن مبارکپوری، الرحیق المختوم، المکتبہ السلفیہ، مئی ۲۰۰۰ء، ص:۲۵۵،۲۵۴

۱۸:شمیم حسین قادری سابق چیف جسٹس لاہور ہائیکورٹ۔لاہور، اسلامی ریاست قرآن وسنت کی روشنی میں، ص ۳۴

۱۹:ابن ثابت، سیرت النبی ﷺ، ج ۱، ص ۳۵۹

۲۰: شمیم حسین قادری سابق چیف جسٹس لاہور ہائیکورٹ۔لاہور، اسلامی ریاست قرآن وسنت کی روشنی میں، علماء اکیڈمی شعبہ مطبوعات محکمہ اوقاف پنجاب، لاہور، ص ۳۴

۲۱:ظفیر الدین، اسلام کا نظام مساجد، دارالاشاعت مقابل مولوی مسافر خانہ، کراچی، ص ۲۳،۲۲

۲۲:شمیم حسین قادری سابق چیف جسٹس لاہور ہائیکورٹ۔لاہور، اسلامی ریاست قرآن وسنت کی روشنی میں، ص ۳۴

۲۳:موسوعہ:سید قاسم محمود، اسلامی انسائیکلوپیڈیا

۲۴:صفی الرحمٰن مبارکپوری، تاریخ مدینہ منورہ، شعبہ تصنیف وتالیف دارالسلام، ص ۷۲۔۔۔٦۹

۲۵:موسوعہ:سید قاسم محمود، اسلامی انسائیکلوپیڈیا،

۲٦:صفی الرحمٰن مبارکپوری، تاریخ مدینہ منورہ، شعبہ تصنیف وتالیف دارالسلام، ص ۷۲۔۔۔

سیدہ عائشہ کے نکاح کے متعلق اشکلات کا جائزہ

حافظ محمد شارق (کراچی)، عدیلہ کوکب (گجرات)

کم عمری میں نکاح

یہاں یہ اشکال یقیناً ایک جدید ذہن کے لیے پریشان کن ہو سکتا ہے کہ خدا نے اپنے پیغمبر محمد ﷺ کے لیے ایک کم سن لڑکی کا ہی انتخاب کیوں کیا؟ مگر فی الواقع اس اشکال کی وجہ معاشرت اور تمدن کے بارے میں انسانی تصورات ہیں جو زمان و مکان کے اعتبار سے تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ یہ بات بالکل ممکن ہے کہ ایک چیز ایک معاشرے میں اخلاقی اعتبار سے معیوب سمجھی جاتی ہو جبکہ کوئی دوسرا معاشرہ اسے عین فطرت کے مطابق سمجھتا ہو۔ آج بھی ہمارے ہاں اس کی بے شمار مثالیں مل سکتی ہیں۔ مثلاً مغرب میں کسی قابلِ احترام شخصیت کے سامنے سر ڈھانپ کر آنا خلافِ ادب سمجھا جاتا ہے جبکہ مشرق میں صورت حال کچھ عرصہ پہلے تک یہ تھی کہ بغیر سر ڈھانپے کسی بڑے بزرگ کے سامنے آنا خلافِ ادب سمجھا جاتا رہا۔ معاشرت سے متعلق معاملات کی اخلاقی حیثیت کا اختلاف آج بھی مختلف معاشروں میں موجود ہے۔

کم سنی میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے آپ ﷺ کی شادی کا معاملہ بھی اسی نوعیت کا ہے۔ آج کے ذہن میں کم سنی کی یہ شادی قابل اعتراض سمجھی جا سکتی ہے لیکن اس دور کی عرب معاشرت میں کم سنی میں شادی کوئی معیوب بات نہ تھی کیونکہ ان کے ہاں بھی اصل چیز بلوغت ہی ہوا

کرتی تھی۔

علم طب کی روشنی میں ہم یہ جانتے ہیں کہ گرم علاقوں میں لڑکیاں جلد ہی بالغ ہو جاتی ہیں۔سیدہ عائشہ بھی نکاح کے وقت بالغ تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ان کے دور کے مخالفین نے بہت سے بے بنیاد الزامات لگائے، مگر اس نکاح پر کسی نے معمولی سی بھی منفی رائے کا اظہار نہ کیا۔خود سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اور ان کے والد کو بھی اس نکاح پر کوئی اعتراض نہ تھا کیونکہ یہ بات عرب کے عرف میں شامل تھی۔ مورخ طبری کی روایت کے مطابق جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا رشتہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے لیے بھیجا گیا تھا تو آپ کی والدہ امّ رومان نے یہ کہا کہ ان کا رشتہ مطعم بن عدی سے پہلے ہی طے ہو چکا ہے۔اس سے یہ دونوں باتیں اچھی طرح واضح ہو جاتی ہیں کہ عرب میں کم عمر میں نکاح ہو جانا ہر گز بھی معیوب نہ تھا، نیز حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی عمر بھی اس وقت اتنی تھی جس میں لڑکیوں کا نکاح کیا جا سکے۔علمائے اسلام کی ایک بڑی تعداد صحیح احادیث کی بنیاد پر یہ رائے رکھتی ہے کہ بوقت نکاح سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی عمر 9 برس تھی جبکہ بعض محققین نے اس وقت کی عمر 19 برس بیان کی ہے۔ بہر حال یہ عمر 9 ہو یا 19، کسی بھی لحاظ سے عرب معاشرت میں قابل اعتراض نہیں تھی۔چنانچہ جدید معاشرتی تصورات کو معیار بنا کر عہد نبوی صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کے اس نکاح پر اعتراض کرنا ایک غیر منطقی بات ہے۔

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا انتخاب

پیغمبروں کی زندگی کے تمام معاملات خدا تعالیٰ اپنی حکمت و تدبیر سے چلاتے ہیں۔انبیاء کی زندگی میں کئی واقعات ایسے ہوتے ہیں جو بظاہر نامعقول نظر آتے ہوں مگر چونکہ وہ خدا کا اذن ہوتے ہیں اس لیے اس پر عمل کیا جاتا ہے اور وقت یہ واضح کر دیتا ہے کہ وہ حکم خدا کی حکمت کے عین مطابق تھا۔نوائیدہ بچے کو ٹوکری میں ڈال کر دریا میں رکھ دینا، اپنے اکلوتے بیٹے پر چھری پھیر دینا بظاہر انتہائی مضحکہ خیز ہے مگر چونکہ خدا کا حکم تھا اور خود خدا نے اس کی حکمت کھول کر رکھ دی، چنانچہ یہ اقدامات قابل اعتراض نہیں بلکہ آج تک قابل تحسین سمجھے جاتے ہیں۔حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کا فیصلہ بھی اسی طرح خدا تعالیٰ نے اپنی حکمت و مشیت سے کیا تھا۔جامع صحیح بخاری اور ترمذی میں روایت ہے کہ :

عالم خواب میں حضرت جبرائیل سبز ریشمی پارچہ پر سیدہ حضرت عائشہ کی تصویر لائے اور عرض کیا۔یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ خاتون دنیا اور آخرت میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زوجہ ہے۔

اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ نکاح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پسند ناپسند کی بنیاد پر نہیں بلکہ اِذن خداوندی پر ہوا تھا جس کے پیچھے امت

کی تعلیم وتربیت جیسی عظیم حکمت کار فرما تھی۔ جس طرح ابراہیمی مذاہب میں منقول دیگر روایات خدائی حکم ہونے کی بنا پر قابل اعتراض نہیں ٹھہرتی، اسی طرح یہ نکاح بھی قابل اعتراض نہیں ہونا چاہیے بالخصوص ایسی صورت میں کہ مذکورہ واقعات خلاف فطرت تھے اور ان کے برعکس یہ نکاح عرب معاشرت کے عین مطابق تھا جس کی تفصیل ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔

اس نکاح کی سب سے اہم حکمت امت کے لیے ایک بہترین معلمہ کی تیاری تھی۔ اپنے والد کی طرح حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بچپن ہی سے نہایت ذہین وفطین تھیں۔ کم عمری میں ہی ان کی ذہانت بہت اعلیٰ اور حافظہ انتہائی قوی تھا۔ پھر رسول اللہ ﷺ کے نکاح میں آنے کے بعد آپ کی تعلیم وتربیت کا حقیقی طور پر آغاز ہوا اور آپ ﷺ انھیں دین کی تعلیم دیتے رہے۔ جہاں کہیں کوئی لغزش نظر آتی، آپ ﷺ فوراً اصلاح فرمالیا کرتے تھے۔ خود سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا بھی اچھے علمی ذوق کی حامل تھیں چنانچہ وہ خود رسول اللہ ﷺ سے اکثر سوالات پوچھا کرتی تھیں اور آپ ﷺ ان کی وضاحت فرمادیا کرتے تھے۔ آپ رضی اللہ عنہانے اپنے شوہر نامدار پیغمبر ﷺ کے ہر ایک فرمان کو اچھی طرح یادرکھا اور انھیں امت تک منتقل کیا۔ اس طرح اس نکاح کی بدولت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد امت کو ایک ایسی عظیم فقیہ، مفسرہ اور معلمہ نصیب ہوئی جن کی تربیت براہ راست پیغمبر خدا ﷺ نے کی تھی۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہانے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلیم پانے کے بعد، امت کی تعلیم وتربیت کے لیے اتنا زیادہ کام کیا، جتنا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تمام ازواج نے مل کر بھی نہیں کیا۔ یہ بات، بلا مبالغہ، درست ہے کہ اس دنیا کے کسی بھی رہنما کی بیوی اس کے کام میں اتنی مددگار ثابت نہیں ہوئی، جتنی حضرت عائشہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کام میں مددگار ثابت ہوئیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے دین سیکھنے والی یہ طالبہ، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد، امت کی معلمہ بن گئیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلَىٰ فِي بُيُوتِكُنَّ مِنْ آيَاتِ اللَّهِ وَالْحِكْمَةِ "(اے نبی کی بیویو) تمھارے گھروں میں اللہ کی آیات اور حکمت کی جو تعلیم ہوتی ہے، اس کا چرچا کرو) کا مجسم نمونہ بنا دیا۔ آپ سے ۲۲۱۰ روایات مروی ہیں۔ یہ روایات، دراصل اس دینی تعلیم کا ایک بے حد اہم حصہ ہیں، جو آپ سے اس امت مسلمہ نے پائی ہے۔ آپ فقیہ بھی تھیں اور مفسر و مجتہد بھی۔ اکابر صحابہ آپ سے مسائل پوچھا کرتے تھے۔ اور آپ حیاتِ نبوی ﷺ کی روشنی میں امت کی رہنمائی کرتی تھیں۔

دوسری حکمت اس شادی کی یہ بھی تھی کہ ان دنوں عرب میں منہ بولے بھائی کو حقیقی بھائی کا درجہ دیا جاتا اور ان کی بیٹیوں سے ایسے ہی نکاح ناجائز سمجھا جاتا جیسا کہ حقیقی بھتیجیوں سے کرنا ناجائز ہوتا ہے۔ اسی رواج کو ختم کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو حضرت ابو بکر کی بیٹی سے نکاح کرنے کا حکم دیا۔ تاکہ اللہ کے احکام تمام لوگوں پر واضح ہو جائیں اور منہ بولے دینی بھائیوں کی بیٹیوں سے نکاح کیا جاسکے۔

سیدہ عائشہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

معترض مستشرقین کی یہ غلطی رہی ہے کہ وہ اس معاملے کو جدیدیت کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے کم سنی میں اس شادی کے واقعے سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کم عمر لڑکی کے ساتھ جنسی تعلقات قائم کیے جو کہ Sexual Harassment کے زمرے میں آتا ہے۔ جبکہ یہ بات ہم واضح کرچکے ہیں کہ اس عمر میں نکاح عربوں کے ہاں عام رواج تھا، لہٰذا یہ نکاح بالکل صحیح تھا، تاہم جنسی تعلق کے بارے میں یہ واضح رہنا چاہیے کہ کسی بھی حدیث یا سیرت کی کتاب میں یہ نہیں لکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے رخصتی کے فوراً بعد ہی کوئی جنسی تعلق قائم کرلیا یا نعوذباللہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا Sexual Harassment کی شکار ہوئی ہوں۔ یہ بات خود ان مستشرقین نے اپنی جانب سے پیش کی ہے۔ نیز اس حوالے سے سب سے بڑی شہادت خود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بھی ہیں جن کی زندگی کے حالات ایک جنسی استحصال کی شکار لڑکی سے بالکل مختلف ہیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے جب رسول اللہ ﷺ کا نکاح طے ہوا تو آپ نے اس وقت کسی بھی مخالفت کا اظہار نہیں کیا۔ بعد ازاں رخصتی پر بھی آپ نے اس رشتے کو خوش دلی سے قبول کیا اور رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ہجرت کرکے مدینہ بھی آئی۔ آپ پوری زندگی اپنے محبوب شوہر رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ خوش رہیں اور کبھی آپ ﷺ کی جانب سے کسی تکلیف کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ دونوں کے مابین محبت اور دوستی کا رشتہ قائم تھا۔

> حضرت عائشہ رضی اللہ عنہہ حضور ﷺ سے تعلیم و تربیت کے بعد امتِ مسلمہ کے لیے اس آیت کا مجسم نمونہ بن گئیں۔
>
> **وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلَىٰ فِي بُيُوتِكُنَّ مِنْ آيَاتِ اللَّهِ وَالْحِكْمَةِ**
>
> ”(اے نبی کی بیویو) تمھارے گھروں میں اللہ کی آیات اور حکمت کی جو تعلیم ہوتی ہے، اس کا چرچا کرو“

صحیح بخاری میں ام المؤمنین سے روایت ہے کہ عید کے دن حبشی سپاہی تلوار اور نیزوں سے کچھ مشقیں کررہے تھے۔ آپ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ ﷺ سے درخواست کی کہ مجھے حبشیوں کا ناچ دیکھنے کا بہت شوق ہو رہا ہے لہٰذا مجھے لے چلئے، رسول اللہ میری گزارش کی تعمیل کرتے ہوئے مجھے لے گئے! اور میں اپنا رخسار رسول ﷺ کے رخسار پر رکھ کر ناچ دیکھنے لگی یہاں تک کہ میں تھک گئی رسول ﷺ نے فرمایا: اے عائشہ! بس کافی ہے یا اور دیکھنا ہے؟ میں نے کہا: اب بس کافی ہے تو رسول ﷺ نے فرمایا۔ ٹھیک ہے، تو اب چلیں جائیے!

اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کبھی باغ میں ان کے ساتھ دوڑ لگاتے، کبھی باہم ہنسی مذاق کرتے، انھیں تعلیم بھی دیتے اور ان کے ساتھ کھیلتے بھی تھے۔ سیرت کی کتابیں رسول اللہ ﷺ اور سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے باہمی تعلق پر روشنی ڈالتی ہوئی ایسی بے شمار روایات سے بھری پڑی

ہیں کہ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی نجی زندگی انتہائی خوشگوار اور محبت والفت سے بھرپور تھی۔ اس باہمی محبت والفت کا یہ عالم تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا میں اس حال میں رخصت ہوئے کہ آپ کا سر مبارک سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی گود میں تھا اور آپ ﷺ نے عائشہ رضی اللہ عنہا کی نرم کی ہوئی مسواک چبائی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ 10 برس زندگی گزاری۔ خلوت و جلوت میں آپ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ رہیں۔ آپ سے تقریباً 2200 احادیث مروی ہیں مگر ان ڈھائی ہزار احادیث میں ایک بھی حدیث ایسی نہیں جس میں آپؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کوئی منفی رائے دی ہو۔ آپ رضی اللہ عنہا کی عائلی، علمی اور معاشرتی زندگی پوری دنیا کے سامنے ہے۔ آپ کی نجی زندگی اور علمی تجزیے کے بعد یہ کہنا عقل سے بعید اور انتہائی مضحکہ خیز ہے کہ نعوذباللہ آپ کسی جنسی استحصال کا شکار ہوئی ہوں۔ اس کے برعکس آپ کی ازواجی زندگی سکون اور خوش حالی کی عکاسی کرتی ہے۔

خلاصہ کلام

- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور رسول اللہ ﷺ کا نکاح خدا تعالیٰ کے حکم پر ہوا۔
- یہ نکاح 9 یا 19 برس کی عمر میں ہوا جو عرب معاشرت کے عرف (رواج) کے مطابق تھا۔ اسی وجہ سے اس نکاح پر کسی کو اعتراض نہیں ہوا۔
- رسول اللہ ﷺ سے تربیت پا کر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا خواتین میں اس امت کی سب سے عظیم معلمہ اور علمی شخصیت کے طور پر پہچانی گئیں۔ قرآن، تفسیر، فقہ، حدیث اور دیگر علوم میں کئی صحابہ کرام آپ سے تعلیم حاصل کیا کرتے تھے۔
- سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی پوری زندگی کے مطالعے کے بعد آپ ﷺ پر ان کے جنسی استحصال کا اعتراض بے سروپا ثابت ہوتا ہے۔
- اس نکاح سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بہت خوش تھی اور آپ نے اپنے شوہر رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ایک بہترین خوشگوار زندگی گزاری۔ یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ حضرت عائشہ اور حضور ﷺ دنیا کے سب سے بہترین میاں بیوی تھے۔

اسلامی حکمران

نجم الحسن (ڈیرہ غازی خان)

شب پر اندھیرا چھاچکا تھا۔ آسمان پر تارے جگمگا رہے تھے۔ لوگ کام کاج سے تھکے ہارے گھروں کے دیے بجھا کے نیند کی وادی میں سکون کے مزے لے رہے تھے۔ مگر ایسے میں ایک صاحب کندھے پر چادر ڈالے، ہاتھ میں عصا لیے۔۔ اپنے ایک خادم کے ہمراہ رعایا کی خبر گیری کے لیے اندھیری رات میں، گلی محلوں، شہر و دیہات۔۔ اور دیگر مختلف مقامات کے وزٹ کے لیے پیدل چل پڑے۔ رات کے اندھیرے میں دور سے فضا میں چھپا ہوا دھواں، جلتی ہوئی آگ کی روشنی پر نظر پڑی تو اس آگ کے دھوئیں کی کھوج لگانے، اسی رخ پر چل پڑے۔ قریب پہنچ کر کیا دیکھتے ہیں کہ بچوں کے رونے کی آوازیں، جلتی آگ کے چولہے پر چڑھی ہوئی ہنڈیاں، اس ہنڈیاں میں۔۔ گرم پانی کی بلبلاہٹ۔۔ ایک خاتون بیٹھی، ہانڈی میں چمچا گھمارہی ہے۔ ساتھ ساتھ اپنے جگر گوشوں کو دلاسے دے رہی ہے۔ روتے بچے کبھی اونگ سے گرتے، تو کبھی بھوک سے تڑپ کر اٹھتے اور آہ زاری کرتے۔ وہ صاحب یہ منظر دیکھ کر کانپ جاتے ہیں۔ دل ڈر سا جاتا ہے۔ چہرے پر افسردگی، آنکھوں میں آبدیدگی سے آنسوؤں کا سیل رواں جاری ہو جاتا ہے۔ کانپتی زبان سے ماجرا پوچھتے ہیں۔ خاتون بتلاتی ہے کہ بچے بھوک سے چلا رہے ہیں۔ گھر میں کھانے کو کچھ نہیں۔ چولہے پر خالی پانی کی ہانڈی چڑھائی ہوئی ہے۔ تاکہ بچے رو رو کر، بہل کر سو جائیں۔

وہ صاحب یہ سن کر واپس پلٹتے ہیں۔ گھٹے ٹوپ اندھیرے میں تیز تیز چلتے ہوئے بیت المال کے دروازے پر پہنچتے ہیں۔ اشیاء خورد و نوش اپنے کندھے پر لادتے ہیں۔ واپس اسی خاتون کے پاس پہنچتے ہیں۔ سامان خاتون کے سپرد کر کے، سالن روٹی تیار کرنے کا کہتے ہیں۔ اور خود بچوں کے ساتھ بیٹھ کر ان کو تسلی دیتے ہیں۔ ان کے آنسو پونچھتے ہیں۔ ادھر سالن روٹی تیار ہو جاتی ہے۔ بچے روٹی کھاتے ہیں۔ پیٹ کی آگ بجھتے ہی بچوں کے چہروں پر مسرت کے آثار دمکتے ہیں۔ تو وہ صاحب بچوں کی آسودہ حالی، چہروں پہ مسکراہٹ اور ان کو نیند کی وادی میں سلا کر واپس پلٹنے لگتے ہیں۔ تو خاتون دعائیں دینے لگی۔ شکر ادا کرنے لگتی ہے اور بولتی ہے کہ عمر کو ایسے ہی خلافت مل گئی جس کو رعایا کی خبر گیری کا بھی علم نہیں۔ کہ کس حال میں ہے۔ تو وہ صاحب پلٹتے ہوئے کہتے ہیں کہ مجھے ہی عمر فاروق کہتے ہیں۔۔ ان بچوں کے وظائف مقرر ہو جائیں گے۔ کل بیت المال سے وصول کر لیں۔ یہ کہہ کر آپ واپس آجاتے ہیں۔ اللہ کے حضور گڑگڑاتے ہیں اور شکر ادا کرتے ہیں کہ اس نے آپ کو عوام کی خبر گیری کرنے کی توفیق دی۔
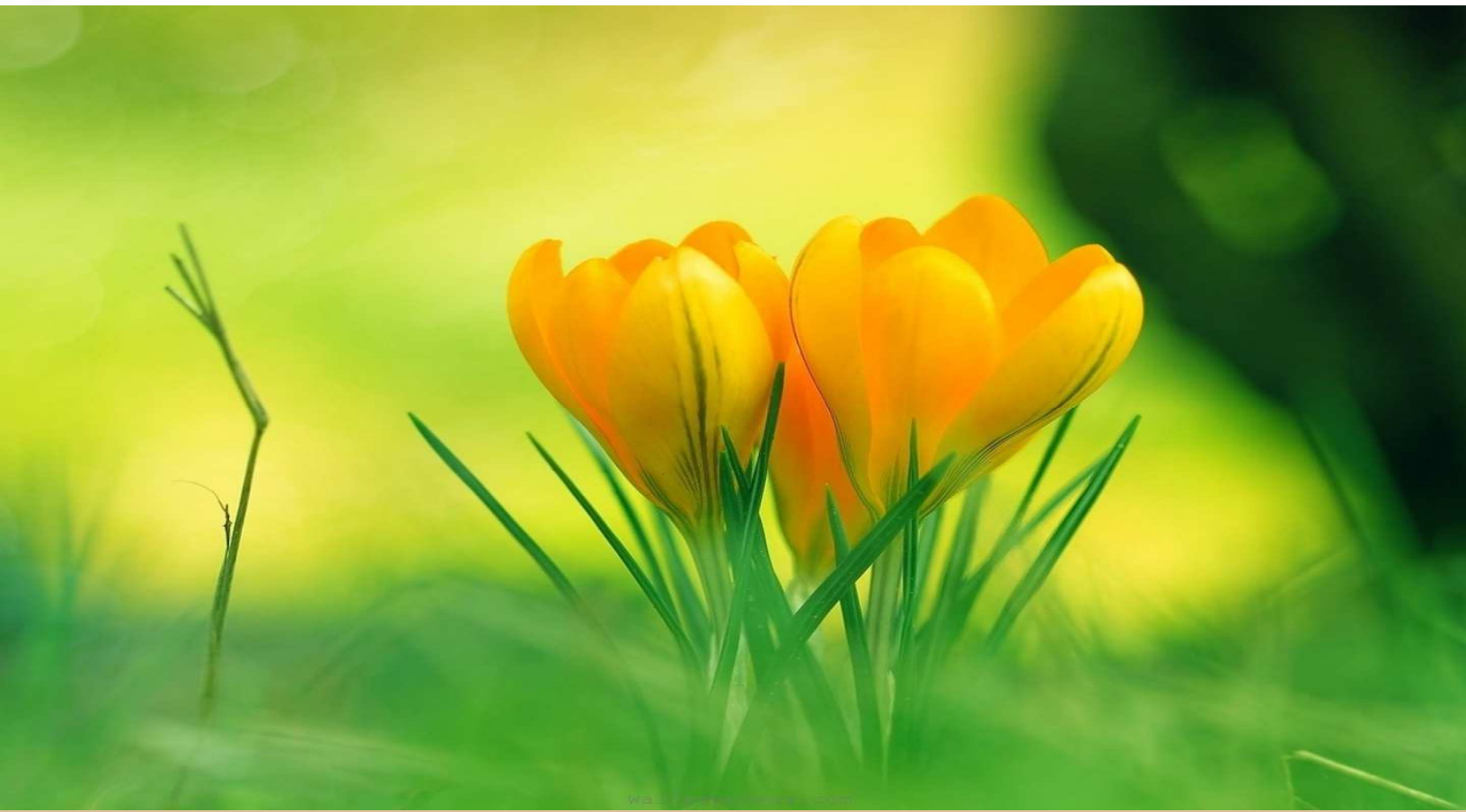
آخری آرام گاہ جنت کا باغیچہ یا جھنم کا گڑھاھے؟

مریم نورین (مردان، پشاور)

دنیا کی حیثیت انسان کے لیے ایک امتحان گاہ کی سی ہے۔ ہر انسان کو اپنے اعمال کے مطابق اس کا رزلٹ اچھا یا برا ملے گا، جس طرح ایک ادارے میں ملازمت کرنے والے شخص کی کامیابی کا انحصار اس کی انتھک محنت اور اچھی کارکردگی پر منحصر ہوتی ہے بالکل اسی طرح بنی نوع انسان اعمال صالحہ پر کاربند رہنے کی بدولت ہی آخرت میں کامیابیوں سے ہم کنار ہوتا ہے۔ منزل آخرت کی ابتدا قبر سے ہوتی ہے جس کے متعلق حدیث حسن میں مروی ہے کہ:

کان عثمان إذا وقفه على قبر بكى حتى يبل لحية فقيل له تذكر الجنة والنار فلا تبكي وتبكي من هذا؟ فقال إن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال إن القبر أول منازل الآخرة فإن نجا منه فما بعده أيسر منه وإن لم ينج منه فما بعده أشد منه قال وقال رسول الله صلى الله عليه وسلم ما رأيت قط إلا القبر أفظع

"عثمان رضی اللہ عنہ جب کسی قبرستان پر ٹھہرتے تو اتنا روتے کہ آپ رضی اللہ عنہ کی داڑھی مبارک تر ہو جاتی ان سے کسی نے کہا کہ جب آپ کے

سامنے جنت اور جہنم کا تذکرہ کیا جاتا ہے تو آپ نہیں روتے اور قبر کو دیکھ کر اس قدر رو رہے ہیں؟ تو عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے آخرت کی منازل میں سے قبر پہلی منزل ہے، سو اگر کسی نے قبر کے عذاب سے نجات پائی تو اس کے بعد کے مراحل آسان ہوں گے اور جسے عذاب قبر سے نجات نہ مل سکی تو اس کے بعد کے، مراحل سخت ترین ہوں گے۔" (سنن ترمذی، رقم الحدیث ۲۳۰۸، ج ۴، ص ۵۵۳)

غور طلب نقطہ یہ ہے کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ جن کا شمار ساتھی رسول ﷺ اور عشرہ مبشرہ کے اصحاب میں ہوتا ہے جن کو جنت کی خوشخبری دنیا میں سنادی گئی ہے ان کا حال یہ ہے کہ عذابِ قبر کے خوف سے اس قدر روتے تھے۔ وہ جن کے اعمال اعلیٰ درجہ کے ہیں۔ کیا ہمارے اعمال اس قدر اعلیٰ ترین ہیں؟ کہ ہمیں کوئی خوف ہی نہیں ہے۔۔ بے خوف ہو کر برائیوں کی دلدل میں پھنستے چلے جا رہے ہیں۔ نہ آخرت کی فکر نہ قبر کے عذاب کی۔۔۔

ابی سعید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

إنما القبر روضة من رياض الجنة أو حفرة من حفر النار

"بے شک قبر جنت کے باغیچوں میں سے ایک باغیچہ ہے یا جہنم کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے۔" (سنن ترمذی، رقم الحدیث ۲۴۶۰، ج ۴، ص ۶۳۹)

بنی نوع انسان اپنے اعمال سے ہی اپنی قبر کو اپنے لیے جنت کا باغ یا جہنم کا گڑھا بناتا ہے۔ جس میں انسان کی عزت و شہرت، مال ومتاع، جاہ وجلال اور حسب نسب وغیرہ کسی بھی چیز کو کوئی دخل حاصل نہیں ہوتا۔ قبر میں کوئی بھی چیز ہمارا ساتھ نہیں دے گی سوائے ہمارے اعمال کے۔ اگر ہمارے اعمال اچھے اور پسندیدہ ہوں گے تو ہمارے لیے قبر کشادہ اور روشن کر دی جائے گی۔ جنت کی طرف سے ایک دروازہ کھول دیا جائے گا، جنت کا بستر بن جائے گا قبر، جنت کا منظر سامنے ہو گا۔ باغ کا سا سماں ہو گا۔ جنت کا لباس پہنا دیا جائے گا، اور قیامت تک کا سارا عرصہ (مدت) بہت آرام سے گزرے گا۔ جب کہ اس کے برعکس اگر اعمال برے ہوئے، تو قبر انسان پر تنگ کر دی جائے گی جس میں اندھیرا اور گھٹن ہو گا۔ دوزخ کی طرف سے ایک دروازہ کھول دیا جائے گا جس سے دوزخ کا منظر نظر آئے گا۔ جہنم کا لباس اسے پہنا دیا جائے گا۔ قبر اس کے لیے دوزخ کا گڑھا بن جائے گا اور قیامت تک کا عرصہ اس پہ طویل بنتا چلا جائے گا۔

یہاں غور کا مقام یہ ہے کہ ہم اپنے اعمال کا محاسبہ کریں۔ جھوٹ، چغل خوری جیسی برائیوں سے بچیں، نہ صرف خود بلکہ اپنے چھوٹوں کو بھی اس سے بعض رہنے کی ترغیب دیں، پیٹھ پیچھے برائی کرنے کو قبیح عمل جان کر دور رہیں۔ اپنے نفس کو تمام برائیوں سے دور رکھیں، ہمارے اعمال تب ہی احسن بن سکتے ہیں جب ہم اپنے نفس کو مغلوب کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

عذابِ قبر سے بچاؤ کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ پیشاب کی چھینٹوں سے حتی الامکان بچا جائے کیوں کہ صحیح بخاری میں عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ:

مَرَّ النَّبِيُّ صلى الله عليه وسلم بِحَائِطٍ مِنْ حِيطَانِ الْمَدِينَةِ، أَوْ مَكَّةَ فَسَمِعَ صَوْتَ إِنْسَانَيْنِ يُعَذَّبَانِ فِي قُبُورِهِمَا فَقَالَ النَّبِيُّ صلى الله عليه وسلم يُعَذَّبَانِ وَمَا يُعَذَّبَانِ فِي كَبِيرٍ ثُمَّ قَالَ بَلَى كَانَ أَحَدُهُمَا لاَ يَسْتَتِرُ مِنْ بَوْلِهِ، وَكَانَ الآخَرُ يَمْشِي بِالنَّمِيمَةِ ثُمَّ دَعَا بِجَرِيدَةٍ فَكَسَرَهَا كِسْرَتَيْنِ فَوَضَعَ عَلَى كُلِّ قَبْرٍ مِنْهُمَا كِسْرَةً فَقِيلَ لَهُ يَا رَسُولَ اللهِ لِمَ فَعَلْتَ هَذَا قَالَ لَعَلَّهُ أَنْ يُخَفَّفَ عَنْهُمَا مَا لَمْ تَيْبَسَا، أَوْ إِلَى أَنْ يَيْبَسَا.

نبی کریم ﷺ ایک دفعہ مدینہ یا مکہ کے ایک قبرستان میں تشریف لے گئے۔ (وہاں) آپ ﷺ نے دو اشخاص کی آواز سنی جنھیں ان کی قبروں میں عذاب دیا جا رہا تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ان پر عذاب ہو رہا ہے اور کسی بڑے گناہ کے سبب نہیں، پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ ایک شخص ان میں پیشاب کی چھینٹوں سے بچنے کا اہتمام نہیں کرتا تھا، اور دوسرا چغل خوری کیا کرتا تھا۔ پھر آپ ﷺ نے کھجور کی ایک ڈالی منگوائی اور اس کو توڑ کر دو ٹکڑے کیے اور ان میں سے ایک ایک ٹکڑا ہر ایک قبر پر رکھ دیا۔ لوگوں نے آپ ﷺ سے پوچھا کہ یا رسول اللہ ﷺ! یہ آپ ﷺ نے کیوں کیا؟ آپ ﷺ نے فرمایا اس لیے کہ جب تک یہ ڈالیاں خشک ہوں شاید اس وقت تک ان پر عذاب کم ہو جائے۔ (صحیح بخاری، رقم 216، ج 1، ص 64)

جب کہ دوسری حدیث مبارکہ میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے صرف پیشاب سے نہ بچنے والے شخص کا ذکر فرمایا اس کے علاوہ کسی اور شخص کا ذکر نہیں فرمایا گیا۔

عذابِ قبر سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے سچی محبت کریں۔ اس محبت کا تقاضہ ہے کہ ہم اخلاق و کردار کے اعلیٰ اوصاف کو اپنا کر دوسروں کو اپنی زبان و ہاتھ کے شر سے محفوظ رکھیں۔ یہی اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے محبت کی نشانی اور دلیل ہے۔

اللہ رب العزت ہم سب پر رحم و کرم فرمائیں اور ہم سب کو عذابِ قبر سے محفوظ رکھیں۔

نیز قبر کو ہمارے لیے جنت کی آرام گاہ بنا دیں۔ آمین

نیا سال مبارک ہو۔۔

عدیلہ کوکب (گجرات)

نیا سال شروع ہوتے ہی ہر طرف مبارک، دعاؤں اور نیک تمناؤں کے سلسلے شروع ہو جاتے ہیں۔ شاعر اپنے شاعرانہ انداز میں نئے سال کو خوش آمدید کہتے ہیں تو نوجوان نسل ایک دوسرے کے ساتھ مل کر ہلا گلا کر کے نئے سال کو ویلکم کہتی نظر آتی ہے۔ کہیں اونچی آواز میں ڈیک چلایا جا رہا تا کہ نئے سال میں نیا جوش و ولولہ ظاہر ہو تو کہیں ٹی وی شوز کی دھوم مچی ہوئی ہے۔ مگر ایسے میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جن کے لیے نیا آنے والا سال نہ ختم ہونے والی تکالیف کا باعث بن جاتا ہے تو کسی کے لیے نئے سال کے آتے ہی گھروں میں صف ماتم بچھ جاتا ہے۔

ئے آنے والا یہ سال اور خوشی و غم کا یہ فرق اصل میں ایک اشارہ ہے ہمارے لیے کہ آئندہ ہماری نئی زندگی جہاں ایک نئی ہی طرز کا سال آئے گا جس کے دن دنیاوی سالوں سے لمبے ہوں گے اور ایک عرصہ کی آزمائش کے بعد آئیں گے۔

وہ نیا آنے والا سال بھی دنیاوی سال کی طرح ہر ایک کے لیے باعثِ خوشی و کامرانی نہیں ہو گا بلکہ اسی طرح کچھ لوگوں کے لیے وہ آنے والا نیا سال بہت سخت اور تکالیف سے بھرپور ہو گا۔ اس دن بھی کچھ لوگ نئے سال کی پہلی صبح ترو تازہ اور زندگی سے بھرپور اٹھیں گے تو کچھ لوگ مرجھائے ہوئے چہروں کے ساتھ اٹھائے جائیں گے۔ دنیاوی اور آخروی نئے سال میں اتنا سا فرق ہو گا کہ یہاں کی خوشی بھی عارضی اور دکھ بھی عارضی ہے جب کے وہاں کی خوشی بھی دائمی اور تکالیف بھی ہمیشہ رہیں گی۔

ایسے لوگ جو دنیاوی ماہ وسال کے بدلنے پر غور و تدبر کر کے انہیں اللہ کی اطاعت میں گزار چکے ہوں گے وہی وہ لوگ ہوں گے جو ترو تازہ اور زندگی سے بھرپور اٹھیں گے جب کہ ایسے لوگ جو اسی دنیا کو اپنا سب کچھ مان کر آخروی زندگی کے ماہ وسال کو بھول گئے اور اپنے خالق کی نافرمانی میں لگے رہے، سرکش اور تکبر و انا سے اپنے نفس کو آلودہ کرتے رہے ایسے لوگ مرجھائے ہوئے چہروں کے ساتھ اٹھیں گے اور ان کے لیے سختیوں اور تکلیفوں کا ایک ناختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ قرآن مجید دونوں طرح کے افراد اور ان کے ساتھ ہونے والے معاملات کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

"پس وہ شخص کہ جس (کے نیکیوں) کے پلڑے بھاری ہوں گے۔ وہ خوشی والی زندگی میں ہو گا۔ اور جس کے (نیکیوں کے) پلڑے ہلکے ہوں گے۔ تو اس کا ٹھکانا ہاویہ ہو گا۔ اور آپ کو کیا معلوم کہ وہ ہاویہ کیا ہے؟۔ ایک دہکتی ہوئی آگ۔"(سورہ القارعۃ:6-11)

جو لوگ خوشی و کامرانی حاصل کریں گے انہیں ہر طرف سے مبارک سلامت دی جائے گی اور خوشی کے نئے سال کے تحائف جنت کی صورت میں ملیں گے جہاں جس چیز کی وہ خواہش کریں گے انہیں مہیا کر دی جائے گی۔ وہ تکیوں کے ساتھ ٹیک لگائے خوبصورت مسندوں پر بیٹھیں گے۔ انہیں وہاں ہر ضرورت و خواہش کی چیز کامیابی کے انعام کے طور پر اس نئے ناختم ہونے والے سال میں بلامعاوضہ مہیا کر دی جائے گی۔ یہ انعامات بھی ناختم ہونے والے اور ہمیشہ رہنے والے ہوں گے اور نہ ان میں یکسانیت ہو گی کہ انسان اکتا جائے۔

دوسری طرف وہ لوگ جن کے لیے سختی کا نیا سال شروع ہو گا انہیں ایسی آگ میں پھینک دیا جائے گا جو ہمیشہ دہکتی رہے گی اور کبھی ٹھنڈی نہ ہو گی۔ اور وہ ہمیشہ اس ناختم ہونے والی آگ میں رہیں گے۔ یہ ان اعمال کا بدلہ ہو گا جو وہ عارضی سالوں میں کرتے رہے ہوں گے۔

غور فرمائیے

☆ کیا ہم نے آخرت میں آنے والے نئے سال کی تیاری کر لی ہے؟

☆ کیا ہم اپنے احتساب میں کامیاب رہے ہیں کہ ہمارے لیے نیا آنے والا وہ سال کبھی ناختم ہونے والی خوشیاں لے کر آئے؟

☆ کیا ہم نے اتنی تیاری کر لی ہے کہ ہم ہمیشہ دہکنے والی آگ سے محفوظ رہیں؟

☆ کیا ہم نے اپنے نفس کو اخلاقی و کرداری خامیوں سے پاک کر لیا ہے؟

اگر ان میں سے کسی ایک بھی سوال کا جواب نہیں ہے تو آج ہی اپنا تزکیہ کریں اور خدا کے حضور جھک جائیں نیز اپنے اور اپنے گھر والوں کے لیے ہمیشہ کی آگ سے بچاؤ کے لیے عملی اقدامات کریں۔ تاکہ نئی زندگی کے نئے سال میں ہمیں ہر طرف سے آواز آئے۔

"مبارک ہو۔ مبارک ہو نیا سال مبارک ہو"

عقلمند کون؟

مدیحہ فاطمہ قاسم (فیصل آباد)

اللہ تعالیٰ سورۃ الروم میں فرماتے ہیں کہ:

يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۖۚ وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ ۝

"لوگ دنیا کی زندگی کا بس ظاہری پہلو جانتے ہیں اور آخرت سے وہ خود ہی غافل ہیں۔" سورۃ الروم، 30:7

یہ آیت آج کی مادی ذہنیت کی عکاسی کرتی ہے۔ آج لوگوں کے نزدیک صرف دنیا ہی دنیا ہے اور آخرت کی کوئی فکر ہی نہیں۔ ہم مسلمان ہیں مگر ہمارا عقیدہ اتنا کمزور ہو گیا ہے کہ ہم اللہ کے احکامات کیا ہیں اس کو بھول بیٹھے ہیں۔ ہم مانتے ہیں کہ اللہ نے پردے کا حکم دیا اس کے باوجود عورتیں بے پردہ گھومتی ہیں۔ ہمیں معلوم ہے جھوٹ بولنے سے اللہ نے منع فرمایا لیکن ہم جھوٹ ایسے بولتے ہیں جیسے سانس لیتے ہیں یعنی عادت اتنی پختہ ہو گئی ہے کہ اب تو ہمیں پتہ بھی نہیں چلتا کہ ہم جھوٹ بول رہے ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ زکوۃ دینا فرض ہے لیکن بہت سے لوگ زکوٰۃ ہی نہیں دیتے کہ ان کے مال میں کمی نہ ہو جائے حالانکہ اللہ نے خود فرمایا کہ اس سے مال بڑھتا ہے۔ نماز فرض ہے لیکن بہت سے لوگ نماز نہیں پڑھتے۔ اتنا بے حس رویہ

صرف اور صرف قرآن و حدیث سے دوری کی وجہ سے ہے۔ کیونکہ لوگوں نے غور و فکر کرنا چھوڑ دیا ہے۔ اس لیے اب انہیں آخرت کا کوئی ڈر ہی نہیں رہا۔ لوگ کہتے ہیں دیکھا جائے گا جو ہو گا۔

آیت پر غور کریں تو پتہ چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ یعملون ظاہراً من الحیاۃ الدنیا یعنی وہ دنیا میں سے بھی صرف ظاہر کو جانتے ہیں پوری دنیا اور اس کے اسرار سے واقف نہیں اور اس کے ساتھ ساتھ وہ آخرت سے بھی غافل ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات اور اس کے تصرفات کو نہ جاننا اور اس کی معرفت حاصل نہ کرنا، یہ جہالت ہے۔ یعنی یہ لوگ دنیا کے ایک پہلو سے تو واقف ہیں کہ مال کس طرح کمائیں، کہاں سے خریدیں، کہاں بیچیں، سائنسی ترقی کیسے کریں، تعمیرات کیسی کیسی بنائیں سامانِ عیش و عشرت کیا کیا مہیا کریں، کیا پہنیں مال کیسے جمع کریں وغیرہ لیکن اسی حیات دنیا کا دوسرا پہلو جو اس کی حقیقت اور اس کے اصلی مقصد کو واضح کرتا ہے کہ یہ دنیا چند روزہ قیام کی جگہ ہے، اصل میں یہ ایک مسافر خانہ ہے انسان یہاں کا مقامی آدمی نہیں بلکہ وہ دوسرے ملک (آخرت) کا باشندہ ہے یہاں کچھ مدت کے لیے ویزا پر آیا ہے، اس کا اصل کام یہ ہے کہ وہ اپنے اصلی وطن کے لیے اس دنیا سے سامان راحت اکٹھا کر کے وہاں بھیجے اور وہ سامانِ راحت ایمان اور اعمال صالح ہیں۔ اس دوسرے رخ سے بڑے سے بڑے عاقل کہلانے والے بالکل غافل اور جاہل ہیں۔

آج کل عقل و حکمت کا سارا انحصار اسی میں سمجھ لیا گیا ہے کہ جو شخص زیادہ سے زیادہ مال جمع کر لے اور اپنی عیش و عشرت کا سامان سب سے بہتر بنا لے وہ سب سے بڑا عقلمند کہلاتا ہے۔ چاہے وہ اخلاقیات سے بالکل خالی ہو۔

آج کل عقل و حکمت کا سارا انحصار اسی میں سمجھ لیا گیا ہے کہ جو شخص زیادہ سے زیادہ مال جمع کر لے اور اپنی عیش و عشرت کا سامان سب سے بہتر بنا لے وہ سب سے بڑا عقلمند کہلاتا ہے اگرچہ وہ انسانی اخلاقیات سے بالکل ہی خالی ہو لیکن عقلی رو سے اسے عقلمند کہنا عقل کی توہین ہے۔ انسان جتنی مرضی دنیاوی ترقی کر لے نئی نئی ایجادات کر لے مال جمع کرنے کے طریقوں سے واقف ہو جائے لیکن اگر وہ اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات کو نہ جانتا ہو اور آخرت سے غافل ہو جہاں دائمی زندگی ملے گی تو ایسے لوگ صاحب عقل و علم نہیں ہیں۔ سورۃ آل عمران میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ:

"بے شک آسمانوں اور زمین کے پیدا فرمانے میں ضرور نشانیاں ہیں عقل والوں کے لیے جو اللہ کو یاد کرتے ہیں کھڑے ہوئے بھی اور بیٹھے بھی اور لیٹے بھی اور وہ آسمانوں اور زمینوں کے بارے میں غور و فکر کرتے ہیں۔"

اس آیت میں ان لوگوں کو عقلمند کہا جا رہا ہے جو اللہ کی یاد میں مشغول رہتے ہیں اور آسمان اور زمین کی تخلیق میں غور و فکر کرتے ہیں یعنی ان کے

ظاہری وجود کو دیکھ کر خالق ومالک اللہ سبحانہ وتعالیٰ جل شانہ کی ذات وصفات کی معرفت حاصل کرتے ہیں۔ جو لوگ صرف دنیا میں ہی مشغول رہتے ہیں اور اسی سے محبت کرتے ہیں خواہ وہ کیسی ہی مشینیں ایجاد کرلیں جتنی مرضی ترقی کرلیں وہ لوگ حقیقی صاحب عقل نہیں ہیں۔ سورۃ زمر میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ:

"آپ ؑ فرمادیجیے کیا وہ لوگ برابر ہیں جو جانتے ہیں اور جو نہیں جانتے پس عقل والے ہی نصیحت حاصل کرتے ہیں۔"

جس کا علم اسے اللہ تعالیٰ کی توحید نہ سکھائے، اس کے رسول ﷺ پر ایمان لانے پر آمادہ نہ کرے اور آخرت کا فکر مند نہ بنائے تو اس کا دنیاوی علم اس قابل نہیں کہ اسے علم کہا جائے۔ قرآن کی زبان میں علم و عقل والے وہ ہیں جو اللہ اور آخرت کو پہچانیں اس کے لیے عمل کریں اور دنیا کی ضروریات کو بقدر ضرورت رکھیں اپنی زندگی کا مقصد نہ بنائیں۔ قرآن وحدیث پر عمل کر کے ہی ہم اپنی ذہنیت کو بدل سکتے اور اصل عقلمند کہلا سکتے ہیں۔

ابھی بھی وقت ہے کہ ہم اپنا محاسبہ کریں اور روز مرہ کا معمول بنالیں

کہ دن میں صرف ایک بار مخلص ہو کر خود سے یہ سوال کریں۔

کیا واقع ہم اصل عقلمند ہیں؟

زندگی کی بے ترتیبی

سید اسرار احمد (کراچی)

زندگی 'ترتیب بلکہ حُسنِ ترتیب کا نام ہے- لیکن کبھی کبھی یہ ترتیب اپنے آپ سے باہر ہو جاتی ہے، جس طرح کناروں کے اندر بہنے والا خاموش دریا کبھی نہ کبھی اپنے آپ سے باہر ہو جاتا ہے اور پھر تمام زندگی کو بے ترتیب کر دیتا ہے، عمیق و تاریک گہرائیوں میں سُکوت کا سمندر ساحل سے ٹکراتے ٹکراتے کبھی آبادیوں پر چڑھ دوڑتا ہے۔

نفع بخش ہوائیں کبھی آندھی و طوفان کا روپ دھار لیتی ہیں اور عتاب بن کر زندگی کو خس و خاشاک کی مانند بکھیر کر رکھ دیتی ہیں، بے ترتیب ہونا عناصر کے پریشان ہونے کا ایک مظاہرہ ہوتا ہے، ایک وارننگ اور ایک چیتاونی ہوتی ہے کہ محفل احباب ہمشہ ترتیب میں قائم نہیں رہتی ہے۔ حلقہ دشمناں بھی ترتیب سے باہر ہو جاتا ہے، انسان بیٹھے بیٹھے اپنی نگاہوں میں بدل سا جاتا ہے، کبھی جن باتوں پر افسوس ہوتا ہے اب ان باتوں پر افسوس نہیں ہوتا کہ انسان جان لیتا ہے کہ حُسن ترتیب عارضی ہے۔

بندشیں ٹوٹ جاتی ہیں، تسبیح کے دانے بکھر جاتے ہیں اور انسان سوچتا رہ جاتا ہے کہ ضبط بے ضبط ہو گیا- احتیاط بے احتیاطی ہو گئی، انسان چنتا ہے گرے ہوئے موتی اور خیال و خامہ کی تسبیح پھر سے مرتب کرنے کی کوشش کرتا ہے ۔

لیکن بے ترتیبی غالب آ کر رہتی ہے، عناصر کی درہمی و برہمی انسان کو گرفت میں لے لیتی ہے اور وہ روتے روتے ہنس پڑتا ہے اور ہنستے ہنستے رو پڑتا ہے۔ زندگی کی اسی بے ترتیبی کے اندر خود کو بے ترتیب ہونے اور ٹوٹ کر بکھر جانے سے بچانا ایک فن ہے اور اسی فن کو حکمت کہتے ہیں۔

3 اگست 2008 کو اخبارات میں ایک خبر چھپی کہ ایک معروف سرکاری شخصیت جو اسلام آباد کی ایک پوش کالونی میں رہائش پذیر تھے، ان کی اہلیہ نے گلے میں پھندا ڈال کر خودکشی کرلی، حالانکہ وہ ایک کامیاب خاتون اور ایک کاروباری ادارے کی بہترین منتظم Manager تھیں، ان کے بارے میں ان کے شوہر نے بتایا کہ وہ ایک مثالیت پسند , Idealist انسان تھیں، اور اسی آئیڈیلزم کے سبب اپنی ذاتی زندگی سے غیر مطمئن تھیں، ان کی زندگی میں کئی ایسے نشیب و فراز آئے جس کے سبب وہ اندر سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھیں، اس ٹوٹ پھوٹ اور عدم اطمینانی نے انہیں اس نہج پر پہنچایا کہ بالآخر انھوں نے زندگی کا ہی خاتمہ کر ڈالا۔

اس دنیا میں کوئی شخص چاہے اعلیٰ عہدیدار ہو یا معمولی ملازم ہر حال میں زندگی کی اونچ نیچ اور نشیب و فراز سے دوچار ہو کر رہتا ہے، زندگی کی یہ ہمہ ہمی ایک ناگزیر برائی ہے، جو بر بنائے امتحان قائم کی گئی ہے، اس صورتِ حال کو گوارا کر لینا سب سے بڑی عقل مندی ہے، کیوں کہ اس کو اگر گوارا نا کرنا مایوسی کی طرف لے جاتا ہے یا خودکشی کی طرف۔

حسّاس ہونا ایک خوبی ہے، کیونکہ اس کا مطلب ہے کہ آپ بے حس نہیں ہیں، لیکن اسی کے ساتھ ساتھ ضرورت سے زیادہ احساس ہونا ایک برائی ہے جس کا نقصان انسان کسی اور کو نہیں خود اپنے آپ کو پہنچاتا ہے۔

بڑی سے بڑی آزمائش آجائے تو گھبرائیں نہیں!.. بڑی سے بڑی حماقت کر بیٹھیں تو دل چھوٹا نہ کریں!... بس یہ یاد رکھیں کہ ٹھیک اسی وقت اور عین اسی لمحہ کوئی ذہین آدمی ہے جو پودینا سمجھ کر ہرا دھنیا خرید رہا ہے۔ اس دروازے کو PUSH کر رہا ہے جس پر صاف صاف PULL لکھا ہوا ہے

یور ٹائم سٹارٹس ناؤ

پروفیسر محمد عقیل (کراچی)

جب ایک طالب علم امتحان دینے جاتا ہے تو اس کی ابتدا اور انتہا کا وقت مقرر ہوتا ہے۔ کوئی شخص نہ تو اس مقررہ وقت سے پہلے امتحان شروع کر سکتا اور نہ اس مقررہ وقت کے بعد امتحان جاری رکھ سکتا ہے۔

جس طرح دنیوی امتحانات کا ایک وقت مقرر ہے تو اسی طرح آخرت کے امتحان کا بھی ٹیسٹ مقررہ وقت پر شروع ہوتا اور اس وقت کے بعد ختم ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر غیبت کے ٹیسٹ کا وقت ایک خاتون کے لیے اس وقت شروع ہوتا ہے جب اسے اپنے ارد گرد کے ماحول میں لوگوں سے حسد، جلن اور بدگمانی ہو۔ جونہی وہ اس ماحول سے نکل کر ایک دور دراز ملک میں جا کر رہنا شروع کرتی ہے جہاں کوئی نہیں جس سے وہ باتیں کر سکے تو اس ٹیسٹ کا وقت ختم ہو چکا ہوتا ہے۔ اب اگر اس نے ناموافق حالات میں تو دل کھول کر اپنے مخالفین کی برائی کی۔ لیکن جب اسے تنہائی ملی اور کوئی غیبت کرنے والا نہ ملا تو خاموش ہو گئی اور یہ سمجھنے لگی کہ میں تو غیبت نہیں کرتی تو غلط فہمی کا شکار ہے۔ دراصل اس نے غیبت کے ٹیسٹ پیریڈ میں ناکامی کا مظاہرہ کیا اور فیل ہو گئی۔ اب وہ خاموش اس لئے ہے کہ حالات بدل گئے ہیں۔

جس طرح نمازوں کا وقت مقرر ہے، روزے کا متعین وقت ہے، زکوٰۃ کی ادائیگی کا ایک خاص موقع ہے اور حج کا مخصوص موسم ہے ایسے ہی دین کے بیشتر امتحانات کا موقع متعین وقت میں ہی ہوتا ہے۔ والدین کے ساتھ حسن سلوک کا موقع ان کی زندگی تک ہے موت کے بعد نہیں، عفو درگذر کے ٹیسٹ کا آغاز اسی وقت ہوتا ہے جب کسی کے خلاف غصہ عروج پر ہو، شوہر یا بیوی کے حقوق کی ادائیگی کا ٹیسٹ ازدواجی زندگی کے دوران ہے۔ ہم سب کو چاہیئے کہ اپنے اپنے امتحانات اور ان کے اوقات کو پہنچانیں۔ ہم دیکھیں کہ اس وقت ہم کس قسم کی آزمائش میں ہیں اور پھر اسی مناسبت سے اپنی کارکردگی پیش کرنے کی کوشش کریں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی خاص معاملے یا مسئلے کے امتحان کا وقت آئے اور گذر بھی جائے لیکن ہمیں پتا تک نہ چلے۔ امتحانی اوقات کو پہچاننا بذات خود ایک آزمائش ہے۔ جو اس آزمائش میں ناکام ہو گیا وہ امتحان میں کامیاب ہو ہی نہیں سکتا۔

احتساب، توبہ اور نفس کو پاک کرنے کا سب سے بہتر وقت اب ابھی ہے۔ اگر یہ لمحہ ہاتھ سے گزر گیا تو نجانے ہمیں دوبارہ میسر آتا بھی ہے یا نہیں

مرضِ جہالت

اُمِ مریم (لاہور)

انسانی جسم میں دو طرح کے امراض پائے جاتے ہیں یعنی طبعی اور روحانی امراض جس طرح کچھ طبعی امراض اپنی آخری سٹیج پر پہنچ کر نا قابل علاج ہوتے ہیں اور نتیجتاً جسم کی تباہی اور موت کا سبب بنتے ہیں اسی طرح کچھ روحانی امراض بھی ایسے ہوتے ہیں کہ اگر بر وقت ان کی تشخیص اور علاج نا ہو سکے تو روح کی بربادی اور آخر کار موت واقع ہو جاتی ہے۔ پہلی صورت کے امراض تو بہر حال بر وقت تشخیص و علاج نا ہونے کی صورت میں نتائج کے لحاظ سے انسان کی دنیاوی اور مادی زندگی کی بربادی کا باعث بنتے ہیں لیکن دوسری قسم کے امراض کا اگر بر وقت تشخیص اور علاج نا ہو سکے تو یہ نا صرف دنیاوی اور مادی بلکہ اخروی اور ابدی زندگی کی تباہی کا باعث بھی بنتے ہیں۔

ایسے ہی روحانی امراض میں ایک بہت بڑا مرض جہالت ہے یہ ایک ایسا روحانی مرض ہے جو گویا سب روحانی امراض کی جڑ ہے تعصب، حسد، جھوٹ، نفس پرستی، تکبر، کینہ و بغض منافقت اور ایسے دوسرے امراض اسی جہالت کے سبب پیدا ہوتے اور پروان چڑھتے ہیں. پلیٹو کہتا ہے کہ کسی شخص کے جاہل رہنے سے اس کا پیدا نا ہونا ہی بہتر ہے کیونکہ جہالت تمام مصائب کی جڑ ہے۔ آیئے اس مرض کی انفرادی اور اجتماعی تشخیص کے لیے اس کی علامات اور اقسام کا جائزہ لیتے ہیں۔

لاعلمی

جہالت کی سب سے پہلی سٹیج یا قسم لاعلمی ہے یعنی علم نہ ہونا یا علم کی کمی۔ وہ دل و دماغ جو علم کی روشنی سے ہمکنار نہ ہوں ان کی مثال اس ویران کھنڈر کی سی ہے جس کا کوئی آباد کرنے والا نہ ہو۔ نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا کہ علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے۔ یہ کیوں ضروری اور فرض ہے؟ اسے اس روایت سے سمجھا جا سکتا ہے کہ ایک مرتبہ عمر رضی اللہ عنہ سے کسی شخص کی نیکی کی تعریف کی گئی کہ وہ اس قدر نیک ہے کہ بدی کو جانتا بھی نہیں۔ آپ نے فرمایا تب تو اس کے بدی میں پڑ جانے کا بڑا احتمال ہے کیونکہ جو شخص بدی اور نیکی میں امتیاز ہی نہیں کر سکتا وہ ہر وقت بدی میں مبتلا ہو سکتا ہے۔ ہم میں سے اکثر لوگ ایسی ہی لاعلمی کی بنیاد پر برائیوں کا شکار ہوتے ہیں مثلاً غیبت بہتان بدگمانی اور بہت سی دوسری اخلاقی بیماریاں جن کی حقیقت سے افراد واقف ہی نہیں ہوتے نہ ان کی وجوہات سمجھتے ہیں نہ اسباب تو وہ کس طرح اس کا سدِباب کر سکتے ہیں؟ جہالت کی اس صورت حال کا واحد حل اپنے اندر علم کی طلب اور چاہت پیدا کرنا ہے۔ لگن کے ساتھ حصول علم کی جستجو ہی ایسے مریض کی صحت یابی کے لیے سود مند ہو سکتی ہے۔

غفلت

ایسا شخص جو جانتا ہے یعنی علم تو رکھتا ہے لیکن یہ نہیں جانتا (مراد احساس نہیں رکھتا) کہ وہ جانتا ہے۔ یہ سویا ہوا ہے اسے بیدار کرو۔ (علی رضی اللہ عنہ) غفلت انسان کی اس کیفیت کا نام ہے جس میں انسان علم تو رکھتا ہے لیکن اپنے اندر احساس یا د علم پر عمل نہیں رکھتا اور علم ہونے کے باوجود اسے اپنی عملی زندگی میں استعمال نہیں کرتا۔ ایسا شخص غافل ہے۔

غفلت کی دو اقسام ہیں۔ ایک قسم تو یہ ہے کہ انسان اپنے عیوب سے غافل ہو۔ ایسا انسان اکثر لوگوں پر بھی ان چیزوں کی وجہ سے نقطہ چینی اور طنز کرنے میں مبتلا ہو جاتا ہے جن میں خود بھی ملوث ہوتا ہے۔ دوسری قسم غفلت کی اپنے علم کے استعمال اور قدر و منزلت سے ناآشنائی ہے یعنی علم ہونے کے باوجود اپنی اس صلاحیت کو بروئے کار نہ لاتے ہوئے عمل کی جانب سے غفلت اختیار کر لینا ہے۔ چنانچہ علم آجانے کے بعد عاقل وہ ہے جو اپنے مقام کو پہچانے اور عملی طور پر اسے اختیار کرنے کے لیے اقدامات کرے جبکہ علم ہونے کے باوجود بھی وہ جاہل ہے اگر وہ اپنی اس صلاحیت کو عمل کے لیے استعمال نا کرے۔

جہل مرکب

تیسری کیفیتِ جہالت، جہل مرکب ہے۔ یہ جہل دو جہل سے مرکب ہے یعنی عدم علم اور توہم علم۔ جاہل مرکب وہ ہے جو نہیں جانتا یعنی علم نہیں

رکھتا اور خیال یہ کرتا ہے کہ میں جانتا ہوں اور انسانوں میں یہ اس مرض کی بدترین صورت حال ہے کسی مفکر کا مشہور قول ہے کہ بدترین جہالت علم کی کمی نہیں بلکہ سب معلوم ہونے کی خوش فہمی ہے۔ جو شخص اپنے بارے میں خوش فہمی میں مبتلا ہوتا ہے دراصل وہ تباہ ہو جاتا ہے اور جو اپنی رائے و نظر سے خوش ہوتا ہے ہلاک ہو جاتا ہے. عیسی ابن مریم علیہ السلام فرماتے ہیں

" بیماروں کا خدا کے اذن سے علاج کیا شفایاب ہو گئے۔ نابینا اور کوڑھیوں کو خدا کے اذن سے شفا بخشی اور مردوں کو باذن الہی زندہ کیا، احمق کا علاج کیا لیکن اس کی اصلاح نہ کر سکا۔ پوچھا گیا اے روح اللہ! احمق کون ہے؟ فرمایا وہ شخص جو خود کو اور اپنی رائے ہی کو سہی سمجھتا ہے، تمام فضیلتوں کو اپنا ہی حق سمجھتا ہے، اپنے کسی عیب کو تسلیم نہیں کرتا، اپنے حقوق کو واجب جانتا ہے اور اپنے اوپر کسی کا حق نہیں سمجھتا۔ یہ شخص ایسا احمق و نادان ہے جس کا کوئی علاج نہیں۔"

ایسے شخص کی کیفیت کے بارے میں امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ عالم جہل کو جبکہ جاہل علم کو جہالت سمجھتا ہے۔ آج ہم میں سے اکثر لوگ ایسے ہیں کہ جب ان کے کسی جاہلانہ عمل یا سوچ کی نشاندہی کی جاتی ہے تو اپنے عمل پر اتراتے ہوئے اصلاح کی بات یا اصلاح کرنے والے ہی کو جاہل اور بیوقوف قرار دے دیتے ہیں جیسا کہ مدینہ کے منافقین کے بارے قرآن بیان کرتا ہے کہ "جب ان سے کہا جاتا ہے کہ ایمان لاؤ تو کہتے ہیں کہ کیا ہم ایمان لائیں جیسا کہ ایمان لائے بیوقوف۔"

"جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد برپا نا کرو تو کہتے ہیں کہ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں"

چنانچہ یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ جہل مرکب جہالت کی بدترین قسم ہے۔

آج بھی ہم میں سے اکثر لوگ اس بیماری کا شکار ہیں اور پھر اپنے اس مرض کو یکسر فراموش کرتے ہوئے زندگی گزار رہے ہیں۔ ہم میں سے تقریباً ہر فرد کی انفرادی و اجتماعی زندگی میں اس کی بکثرت علامات پائی جاتی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ہم ان سے نظریں چراتے ہیں یا پھر اپنے آپ کو روحانی طور پر نہایت مضبوط اور صحت مند خیال کر لیتے ہیں۔

ہمارا فرض ہے کہ ہم میں سے ہر کوئی یہ دریافت کرے کہ شعوری یا لاشعوری طور پر کہیں ہمارے اندر مرض جہالت تو نشو و نما نہیں پا رہا۔ اگر ہم جھوٹ، منافقت، بغض کینہ پروری، حسد، نفس پرستی، لاعلمی، تعصب، خود پسندی یا ایسی دوسری بیماریوں میں مبتلا ہیں تو یقیناً یہ مرض ہمارے اندر پرورش پا رہا ہے اور ہمیں اپنی اپنی سطح پر ہر ممکن ذرائع سے اس کے علاج کی کوشش کرنی چاہیے۔ ورنہ جلد ہی وہ دن آنے والا ہے جب ہم علاج کی خاطر قدرت کے عطا کیے ہوئے سب ذرائع اور وسائل کھو کر اس کے بدترین اور ابدی انجام کی طرف پہنچ جائیں گے۔ اور پھر سوائے پچھتاوے اور ہماری ابدی تباہی کے ہمیں کچھ بھی حاصل نا ہو گا۔

اللہ کے راستے سے گریزاں نہ ہونا

عظمی عنبرین (ڈی۔ جی۔ خان)

انسان جب اس دنیا میں پہلا قدم رکھتا ہے۔ اس وقت سے لے کر موت تک اس کا لوگوں کے ساتھ کچھ اس طرح تعلق استوار ہو جاتا ہے کہ وہ کسی طور پر لاتعلق نہیں رہ سکتا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس سے وابستہ ان لوگوں کی تعداد میں کبھی کمی اور کبھی اضافہ ہوتا رہتا ہے ۔انسان کے یہ رشتے دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جن سے خون کا رشتہ نہیں ہوتا، جن کا شمار دوست احباب یا ایمان و تقوی کے ساتھیوں میں ہوتا ہے ، یہ عموماً ہمارے ہم مزاج و ہم طبیعت ہوتے ہیں۔ دوسری قسم کے لوگوں کو عرف عام میں عزیز و اقارب کہتے ہیں۔ ان میں شریک حیات، ان دونوں کے والد، والدہ، اولاد، بھائی، بہنیں، دادا، دادی، پردادا، پردادی، چچا اور ان کی اولاد در اولاد، پھپھیاں اور ان کی اولاد در اولاد ، بھتیجے، بھتیجیاں اور ان کی اولاد در اولاد . بھانجے، بھانجیاں اور ان کی اولادیں، نانا، نانی، پرنانا، پرنانی، خالائیں، ماموں اور ان کی اولادیں۔ یہ سب رشتہ دار کہلاتے ہیں ان عزیز و اقارب سے مل کر خاندان بنتا ہے، جو انسانیت کی شناخت و تعارف ہوتا ہے۔ اکثر خوشی و غمی، مرض اور اس کے بعد پھر صحت یابی وغیرہ کے مواقع پر رشتہ داروں کے ساتھ تعلقات کی قابل تعریف جھلک دیکھنے میں آتی ہے۔ جو عقلی، مذہبی اور معاشرتی طور پر رشتہ داریوں کو جوڑے رکھنے کی اہمیت واضح کرتی ہے۔ ان رشتہ داریوں کو جاننے اور مضبوط بنائے رکھنے کی اہمیت اس بات سے بھی معلوم ہوتی ہے کہ جو رشتہ داریوں کو جوڑتا ہے اللہ اسے اپنے ساتھ جوڑے رکھتا ہے اور تعلق توڑنے والے اللہ کی رحمت سے محروم ہو جاتے ہیں۔ یہ خودکار قانون فطرت ہے۔ ہمارے دین میں اسی چیز کو صلہ رحمی (رشتہ داری جوڑ کے رکھنا) اور قطع رحمی (رشتہ داری توڑ دینا) کہا گیا ہے بغیر کسی تخصیص کے ہر شخص خواہ وہ امیر ہے یا غریب، نیک ہے یا بد۔ اگر صلہ رحمی کرنے والوں میں شامل ہے تو فطرت کے اس قانون سے فوائد حاصل کر رہا ہے۔ اگر قطع رحمی کرنے والوں میں شامل ہے تو اپنے حالات کا جائزہ لے کر دیکھ سکتا ہے کہ وہ کن نقصانات سے دوچار ہو رہا ہے صلہ رحمی

دین کی کتاب کا ایک اہم باب ہے۔ جس کا ادنی درجہ یہ ہے کہ عزیز و اقارب کے ساتھ سلام و ملاقات کا تعلق باقی رکھا جائے اور اعلی درجہ یہ ہے کہ ان کی طرف سے قطع تعلق یا زیادتیوں کے باوجود ان سے تعلق باقی رکھا جائے جب تک ہماری طبیعتوں میں یہ بات رچ بسے گی نہیں تب تک ہم حقیقی کامیابی حاصل نہیں کر سکیں گے۔ اللہ والو! اللہ کے راستے سے گریزاں مت ہوا کرو. تا کہ پریشانیوں، دکھوں اور تکلیفوں سے بچ سکو۔

انسان اللہ کو پیارے ہوتے ہیں اس لیے ان سے پیار کرنا چاہیے

تا کہ اللہ عزت عطا فرمائے۔

واصف علی واصف

لَبَّيْكَ اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ
لَبَّيْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ لَبَّيْكَ
اِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَكَ وَالْمُلْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ

سفرنامہ۔۔۔ ابلیس سے جنگ کی روداد

پروفیسر محمد عقیل (کراچی)

رفث، فسوق اور جدال

حج کے بارے میں قرآن میں اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر ہدایات دیں جن میں سب سے اہم ہدایت اس آیت میں ہے:

> حج کے مہینے سب کو معلوم ہیں۔ جو شخص ان مقرر مہینوں میں حج کی نیّت کرے، اسے خبر دار رہنا چاہیے کہ حج کے دوران میں اس سے کوئی شہوانی فعل، کوئی فسق وفجور، کوئی لڑائی جھگڑے کی بات سرزد نہ ہو۔ اور جو نیک کام تم کرو گے، وہ اللہ کے علم میں ہو گا۔ سفر حج کے لیے زادِ راہ ساتھ لے جاؤ۔ اور سب سے بہتر زادِ راہ پرہیز گاری ہے۔ پس اے ہوشمندو! میری نافرمانی سے پرہیز کرو۔
>
> (البقرہ ۲:۱۹۷)

اس آیت میں واضح طور پر تین باتوں سے منع کیا گیا ہے جن میں پہلی ہدایت یہ ہے کہ رفث نہ ہو۔ رفث شہوانی باتوں کو کہتے ہیں۔ جنسی امور دو طرح کے ہوتے ہیں جائز اور ناجائز۔ حج کے دوران نہ تو کوئی جنسی عمل یعنی جماع کی اجازت ہے اور نہ ہی جنسی بات چیت کی۔ اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ حج جہاد کی ایک شکل ہے اور جہاد میں اصل مقصد اپنے دشمن کو شکست سے دوچار کرنا ہے نہ کہ جنسی معاملات سے لذت حاصل کرنا

۔اس قسم کی کوئی بھی کوتاہی انسان کو اپنے اصل مقصد سے ہٹادیتی ہے۔

دوسری بات جس سے منع کیا گیاوہ ہر قسم کا چھوٹا اور بڑا گناہ ہے۔یوں تو گناہ ویسے ہی ممنوع ہے لیکن حرم میں یہ بدرجہ اولیٰ منع ہے۔حج میں گناہ کا جان بوجھ کر ارتکاب ایسا ہی ہے جیسے کوئی فوجی پیٹھ پھیر کر میدان جنگ سے فرار ہو جائے اور اسی پر بس نہ کرے بلکہ دشمن کی فوجوں میں شامل ہو جائے۔حج کا مقصد خدا کی غلامی کا تقاضا پورا کرتے ہوئے طاغوتی محرکات کو شکست دینا ہے لیکن جب کوئی شخص گناہ کا ارتکاب کرتا ہے تو وہ خدا کی بندگی سے نکل کر طاغوت کی یلغار کا شکار ہو جاتا ہے۔لہٰذا ابلیس کو شکست دینے کے لیے لازم ہے کہ خدا کی ہر چھوٹی اور بڑی نافرمانی سے حتی المقدور گریز کیا جائے۔

تیسری چیز جس سے روکا گیاوہ لڑائی جھگڑا ہے۔اس میں ہر وہ عمل شامل ہے جو یا تو بذات خود لڑائی ہو یا کسی فساد کا سبب بنے۔جدال سے مراد زبانی لڑائی، بد تمیزی، بدگوئی اور ہاتھا پائی ہے۔لڑائی کے اسباب میں ایذارسانی، طنزو تشنیع، دھکے بازی، بے احتیاطی سے طواف کرنا، بدگمانی، بہتان، تکبر وغیرہ شامل ہیں۔ان سب سے گریز لازمی ہے ورنہ حج کے ثمرات حاصل کرنا مشکل ہے۔

یہ آیت میں نے اس سے قبل بھی کئی مرتبہ پڑھی تھی لیکن سمجھ میں اس وقت آئی جب حرم پہنچا۔ جہاں ان تینوں گناہوں کے مواقع بدرجہ اتم موجود ہوتے ہیں۔دنیا بھر سے مختلف رنگ و نسل کے مسلمان حاضر ہوتے ہیں۔ان میں خاص طور پر شام، لبنان اور مصر کے لوگ غیر معمولی طور پر حسین ہوتے ہیں۔اس تنوع اور ظاہری حسن کی بنا پر بدنگاہی کا پورا امکان موجود ہوتا ہے۔دوسری جانب لوگوں کی جائز جنسی ضروریات پر بھی پابندی کی بنا پر صنف مخالف میں کشش بڑھ جاتی ہے۔نیز مطاف میں عورت اور مرد ایک ساتھ طواف کررہے ہوتے ہیں جس سے ایک دوسرے سے جسمانی طور پر بچنا بعض اوقات دشوار ہو جاتا ہے۔یہ سارے عوامل شہوت کو ابھارنے میں معاون ہوسکتے ہیں اس لئے پہلے ہی حکم دے دیا کہ جائز و ناجائز جنسی عمل سے متعلق ایک لفظ بھی زبان پر نہ آئے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب خیالات میں پاکیزگی اختیار کی جائے اور یکسو ہو کر حج کے فلسفے پر عمل کیا جائے۔

جہاں تک عام زندگی کا تعلق ہے تو مسلمان بالعموم مختلف گناہوں میں ملوث ہوتے ہیں لیکن حج ایک تزکیہ اور تربیت کا عمل ہے۔چنانچہ یہاں اپنے آپ کو ہر قسم کے گناہ سے بچانا، آئندہ کے لیے تربیت حاصل کرنا اور اسے ترک کرنے کا عزم کرنا لازمی ہے۔اسی بنا پر ہر قسم کے گناہ کو حرام قرار دیا گیا ہے۔حج میں عام طور پر لوگ جن گناہوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں ان میں زبان کے گناہ یعنی جھوٹ، غیبت، بہتان، بدزبانی، لغو باتیں، گستاخانہ مکالمے وغیرہ شامل ہیں۔اسی طرح لوگ غیر قوم کے لوگوں کی زبان اور باڈی لینگوتج نہ سمجھنے کی بنا پر بدگمانی، ٹوہ لینا، حسد، نفرت، کینہ وغیرہ جیسے گناہوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔طواف کے دوران دھکے دینا، حجر اسود کو بوسہ دینے کے لیے لوگوں کو ایذا دینا، راستے میں نماز پڑھنے کے لیے کھڑے ہو جانا بھی بہت عام گناہ ہیں۔نیز بازاروں میں اسراف کرنا، اللہ کی یاد کی بجائے شاپنگ میں وقت ضائع کرنا، خاص طور پر فجر کی نماز

ترک کرنا بھی چند اور غیر مطلوب کام ہیں۔ سب سے اہم گناہ اللہ کے شعائر کی بے حرمتی کرنا ہے۔ اس میں مسجد الحرام میں بلاوجہ شور شرابہ، ہنسی مذاق، طواف میں بے ادبی، صفامروہ کی تکریم نہ کرنا اور ان جگہوں کو پکنک پوائنٹ کے طور پر استعمال کرنا وغیرہ شامل ہیں۔ ان سب سے بچنے کے لیے تعلیم اور تربیت دونوں کی ضرورت ہے۔ (جاری ہے۔۔۔۔۔)

رسائل ومسائل

قتل کا قصاص کیوں ضروری ہے؟

محمد مبشر نذیر (جدہ)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمْ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلَى الْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالأُنثَى بِالأُنثَى فَمَنْ عُفِيَ لَهُ مِنْ أَخِيهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ وَأَدَاءٌ إِلَيْهِ بِإِحْسَانٍ ذَلِكَ تَخْفِيفٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ فَمَنْ اعْتَدَى بَعْدَ ذَلِكَ فَلَهُ عَذَابٌ أَلِيمٌ۔ وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ يَا أُوْلِي الأَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ۔ (البقرة 2: 178-179)

اے اہل ایمان! تمہارے لئے قتل کے مقدموں میں قصاص کو قانون بنایا گیا ہے۔ آزاد آدمی نے قتل کیا ہو تو اس آزاد ہی سے بدلہ لیا جائے۔ غلام قاتل ہو تو وہی غلام قتل کیا جائے اور عورت اس جرم کی مرتکب ہو تو اسی سے قصاص لیا جائے۔ ہاں اگر کسی قاتل کے ساتھ اس کا (دینی) بھائی نرمی کے لئے تیار ہو تو رواج عام کے مطابق دیت کا تصفیہ کیا جائے اور قاتل پر لازم ہے کو وہ احسن طریقے سے ادائیگی کرے۔ یہ تمہارے رب کی طرف سے تخفیف اور رحمت ہے۔ اس پر جو بھی زیادتی کرے، اس کے لئے دردناک سزا ہے۔ اے اہل عقل! تمہارے لئے قصاص کے اس قانون میں زندگی ہے تا کہ تم (اللہ کے قانون کی خلاف ورزی سے) بچنے والے بنو۔

اللہ تعالی کے قانون میں انسانی جان کو بے پناہ حرمت دی گئی ہے۔ حجۃ الوداع کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آخری عام خطبے میں جو تعلیمات ارشاد فرمائیں اس میں انسانی جان، مال اور آبرو کی حرمت کو بیت اللہ کی حرمت کے برابر قرار دیا۔

قتل دو طرح کا ہوا کرتا ہے: ایک تو قتل عمد، جس میں قاتل پورے ارادے اور منصوبے سے قتل کرتا ہے اور دوسرا قتل خطا جس میں غلطی سے بغیر ارادے کے کوئی شخص ہلاک ہو جائے۔ پہلی صورت کا قانون یہ بیان کیا گیا کہ ایسا کرنے والے قاتل کے ساتھ وہی معاملہ کیا جائے جو اس نے مقتول کے ساتھ کیا۔ انسانوں کی غالب اکثریت نے اس معاملے میں اسی قانون پر عمل کیا۔ تاریخ عالم گواہ ہے کہ جس معاشرے میں اس قانون پر عمل کیا گیا، وہاں انسانی جان کی حرمت برقرار رہی۔ جس معاشرے نے بھی اس قانون سے منہ موڑا، اس کے نتیجے میں اس معاشرے میں انسانی خون پانی سے بھی سستا ہوا جس کے نتیجے میں پورا معاشرہ انتشار کا شکار ہو گیا۔ اسی انتشار سے بچنے کے لیے قتل کے قصاص کو اللہ کی طرف سے ضروری قرار دیا گیا۔

اس کے ساتھ ہی اللہ تعالی کی شریعت میں اس بات پر بھی زور دیا گیا ہے کہ قتل کی سزا صرف اور صرف قاتل کو ہی دی جائے۔ ہماری دیہاتی اور قبائلی معاشرت میں قتل کی سزا بالعموم قاتل کے ساتھ ساتھ اس کے قریبی رشتے داروں بالخصوص اس کی بیوی، بہن اور بیٹی کو بھی دی جاتی ہے۔ ایسا کرنے والا اپنی حد سے تجاوز کرنے والا ہے جس کے لئے اللہ تعالی کے ہاں دردناک عذاب منتظر ہے۔

قصاص کے ساتھ ہی اللہ نے دوسری چیز کو بھی بیان کیا ہے کہ اگر مقتول کا وارث، قاتل کو معاف کر دینے پر راضی ہو تو اسے معاشرے کے قانون کے مطابق دیت کی رقم ادا کرنا ضروری ہے۔ اللہ تعالی نے اس حکم کا تذکرہ جن الفاظ میں کیا ہے ان سے واضح ہے کہ ایسا کرنا اللہ تعالی کو پسند ہے کیونکہ اس کے نتیجے میں معاشرے میں نفرت اور انتقام در انتقام کی فضا کی بجائے محبت و الفت کی فضا پیدا کی جا سکتی ہے۔

اس بات کا بھی خیال رہنا چاہیے کہ قصاص کی اس سزا کا نفاذ صرف اور صرف معاشرے کے نظم اجتماعی یعنی حکومت کا فرض ہے۔ اگر کوئی حکومت اس معاملے میں دین کے حکم پر عمل نہیں کرتی اور ناانصافی سے کام لیتی ہے تو قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے کی بجائے مقتول کے ورثا کو یہ معاملہ اللہ تعالی پر چھوڑ دینا چاہیے جو کبھی ناانصافی نہ کرے گا اور ہر مجرم کو اس کی پوری سزا دے گا۔ ہمارے معاشرے میں ایسے معاملات میں جو جذباتی فضا بنا کر مقتول کے ورثا کو خود انتقام لینے پر مجبور کیا جاتا ہے وہ اللہ تعالی کے احکام کی کھلی خلاف ورزی ہے۔ ایسے مواقع پر بہترین طرز عمل اپنے معاملے کو اللہ تعالی کے سپرد کر دینا ہے اور صبر کرنا ہے جس کی جزا انسان کو اس دنیا اور آخرت دونوں میں مل کر رہے گی۔

متفرقات

حمد

تو مالک سلطان ہے اللہ
ہم سب کا نگہبان ہے اللہ

جہاں بھی دیکھیں جدھر بھی دیکھیں
موجود تو ہر آن ہے اللہ

تیرے سوا مسجود نہیں کوئی
اس پر میرا ایمان ہے اللہ

سب مخلوق کو روزی دینا
تیرے لیے آسان ہے اللہ

سب کچھ تو نے مجھ کو دیا ہے
مجھ پہ تیرا احسان ہے اللہ

میں تیری توصیف لکھوں گا
جب تک جسم ہے جان ہے اللہ

شاعر: حکیم خان حکیم

نعت

دل کے حرا میں، اپنے خدا سے، تیرے سوا کچھ نہیں مانگا
تو مرا اول، تو مرا آخر، تو مرا ملجا، تو میرا ماویٰ

کتنے صحیفے میں نے کھنگالے، نصف اندھیرے، نصف اجالے
تو ہی حقیقت، تو ہی صداقت، باقی سب کچھ صرف ہیولیٰ

یوں تو ہزار سیانے آئے، روح کا دشت بسانے آئے
تیری گھٹا صحراؤں پہ اُمڈی، ابر ان کا دریاؤں پہ برسا

بت خانے حیراں کھڑے ہیں، بت تیرے قدموں میں پڑے ہیں
تیرے جمال کی زد میں آکر، کیسا کیسا پتھر ٹوٹا

تو نے دیا مفہوم نمو کو، تو نے حیات کو معنی بخشے
تیرا وجود اثبات خدا کا، تو جو نہ ہوتا، کچھ نہ ہوتا

شاعرانہ انتخاب

تقلید اسی کو کہتے ہیں
جو سوچ لیا بس کہہ ڈالا
جو کہہ ڈالا پیچھے نہ ہٹے
پیچھے نہ ہٹے اک انچ ذرا
حق سامنے جب بھی آیا کبھی
اپنے ہی تعصب کے آگے
حق بات کو بھی رد کر ڈالا
اپنا ہی موقف ٹھیک لگا
اپنی ہی کتابیں پڑھتے رہے
اپنے ہی سلیبس وضع کیے
اور چھوڑ دیا اس رسی کو
اور پھیل گئے فرقے فرقے
شاعر: سلمان حامد

مجھے اس طرح اپنی محبت میں مصروف کر دے میرے اللہ کہ
مجھے سانس تک نہ آئے تیرے ذکر کے بغیر

زمانے کا سہارا تو بظاہر اک دکھاوا ہے
حقیقت میں مجھے میرا خدا گرنے نہیں دیتا

لفظ لفظ موتی

* توبہ روح کا غسل ہے جتنی بار کی جائے روح میں نکھار آتا ہے۔
* اگر مایوسی دل میں ڈیرے ڈالنے لگے اور دل مستقل بے چینی و بے سکونی کی حالت میں ہو تو سمجھ لو توبہ کا وقت آ گیا ہے۔(عدیلہ کوکب)
* ٹھیک وقت پر پیئے ہوئے کڑوے گھونٹ زندگی کو میٹھا کر دیتے ہیں۔
* انسان کسی دوسرے کے لیے کچھ نہیں کر سکتا سوائے حوصلہ بڑھانے کے۔ اکثر رشتوں اور دوستوں کے ہجوم میں لوگوں کو ٹوٹتے ہوئے دیکھا ہے کہ کسی نے انہیں یہ نہیں کہا "حوصلہ رکھ یار! اللہ کرم کرے گا"یقین کریں بہت طاقت ہے اس جملے میں۔ جب ہم کسی کے ہمدرد نہیں بنتے تب درد ہم سے اور ہم درد سے جدا نہیں ہوتے۔ (شکیل انصاری)
* ہر جگہ خوشی، محبت اور امید ایسے بانٹیں کہ آپ سے ملاقات ہر شخص کے لیے زندگی کا خوشگوار تجربہ ہو
* اگر اللہ کی رحمت کے امیدوار ہو تو اس کی مخلوق پر رحم کرو۔ (مسز عنبرین)
* اللہ کی قربت عبادات سے حاصل ہوتی ہے، اور سب سے بڑھ کر فرض نماز کو اپنے وقت پر ادا کرنا اور پورے اہتمام سے ادا کرنا اللہ کی قربت کا یقینی ذریعہ ہے۔ (سید اسرار احمد)

قرآن اور ہم

نوید شاہد (لاہور)

اللہ تعالیٰ نے قرآن کو پوری دنیا کے انسانوں بشمول مسلمانوں کی ہدایت اور رہنمائی کے لیے بھیجا ہے۔ لیکن افسوس کہ ہم نے قرآن پاک کو بجائے سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کے اس کو ثواب حاصل کرنے کا ایک ذریعہ بنا لیا ہے۔ اگر ہم قرآن پاک کو پڑھنے کے ساتھ ساتھ اس کو سمجھنے کی کوشش کریں اور اس میں سے ثواب کے ساتھ اس کی ہدایت، اخلاقیات اور تربیت سے بھی مستفید ہوں تو ہم اس دنیا کے ساتھ ساتھ آخرت کی زندگی میں بھی سرخرو ہو جائیں گے۔ قرآن کا اصل مقصد ہے انسانیت کی رہنمائی اور اس کی بھلائی دنیا و آخرت دونوں جہانوں میں۔ مگر افسوس کہ ہم اسے بھی اپنی ذاتی غرض کے لیے استعمال کرتے ہیں اور اس کو صرف ثواب کمانے کی خاطر پڑھتے ہیں۔ اگر ہمارے معاشرے کے لوگ قرآن پاک کی ہدایت پر عمل کرنا شروع کر دیں اور ثواب کے ساتھ ساتھ اس سے ہدایت بھی حاصل کرنا شروع کر دیں تو ہم جلد ہی معزز اور باشعور قوموں میں شمار ہو سکتے ہیں۔ ہم قرآن پڑھ رہے ہوتے ہیں لیکن ہمیں یہ نہیں پتہ ہوتا کہ ہم کیا پڑھ رہے ہیں۔ جو ہم پڑھ رہے ہیں اس کا کیا مطلب ہے۔ بس ہم پڑھ رہے ہیں اور ثواب مل رہا ہے۔ کیا ہمارے لیے یہ لمحہ فکریہ نہیں کہ جس مقدس کتاب پر ہمارے دین کا دارومدار ہے ہم اسے ہی نہیں سمجھ پا رہے اور نہ ہی اس کو سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اکثر شادی کی تقریبوں کی میں ہم دیکھتے ہیں دلہن کو قرآن پاک کے سائے میں رخصت کیا جاتا ہے اگر ہم اس کو قرآن پاک کے سائے میں رخصت کرنے کے ساتھ ساتھ اس کو قرآن پاک کی تعلیمات سے روشناس کروائیں تو وہ اس کے لیے زیادہ بہتر ہو گا اور وہ اپنی اولاد کی طربیت بھی اچھی کر سکے گی اور ان کو ایک اچھا اور باشعور انسان اور مسلمان بنانے میں بھی مددگار ہو گی۔ لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے ہاں ایسے اقدامات کا فقدان ہے۔